© rasailojaraid.com

ڈاکٹر محمود احمد غازی

علم حدیث

ضرورت واہمیت اور حدیث بہ طور ماخذ شریعت

ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآن مجید اور سنت رسول مسلمانوں کے لئے شریعت اور قانون سازی کا اولین اور ابتدائی ماخذ ہے۔ محدثین کرام کی غالب اکثریت کے نزدیک حدیث کی اصطلاح عام ہے اور سنت کی اصطلاح خاص ہے۔ سنت سے مراد وہ طریقہ یا وہ انداز اور ڈھنگ ہے جس پر کوئی انسان زندگی گزارتا ہے یا جس کے مطابق کوئی کام کرتا ہے۔ اچھے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے اور برے ڈھنگ کو بھی سنت کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں سنت کا لفظ دونوں قسم کے انداز اور ڈھنگ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ خود حدیث پاک میں بھی یہ لفظ ان ہی عمومی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک مشہور حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من سن في الاسلام سنة حسنة، فعمل بها بعده، كتب له مثل اجر من عمل بها، ولا ينقص من اجورهم شئ، و من سن في الاسلام سنة سئة، فعمل بها بعده، كتب له مثل وزر من عمل بها، ولا ينقص من اوزارهم شئ (۱)

جس نے اسلام میں کوئی اچھی سنت پیدا کی، یعنی اچھا ڈھنگ اختیار کیا، کوئی اچھی ریت ڈالی یا اچھا طور طریقہ نکالا اور اس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوئے تو اس کو اس کا اجر ملے گا اور جو لوگ آئندہ اس پر عمل کریں گے ان کا اجر بھی اس کو ملتا رہے گا، لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔ اور جس شخص نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا، برا ڈھنگ یا بری ریت ڈالی، اور اس پر بعد میں آنے والے لوگ عمل پیرا ہوئے تو اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو اپنے کرتوت کا بھی گناہ ملے گا اور جو لوگ اس برے ڈھنگ کو اختیار کریں گے ان کے گناہ میں بھی یہ شخص شریک رہے گا، لیکن ان کا اجر کم نہیں ہوگا۔

یہاں سنت کا لفظ اچھے طریقے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔اس مثال سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ سنت کا لفظ عربی زبان میں طریقے، ڈھنگ یا ریت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کی اصطلاح میں سنت کے ایک معنیٰ تو وہ ہیں جو پہلے بیان کئے گئے ہیں یعنی رسول اللہ ﷺ کا وہ طرز عمل جس کی آپ نے دعوت دی، جس کو قائم کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ دنیا میں بھیجے گئے اور جو صحابہ کرام نے آپ سے سیکھ کر اختیار کیا اور نسلاً بعد نسلٍ مسلمانوں تک منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔اس طریقے کو اسلام کی اصطلاح میں سنت کہتے ہیں۔جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن وسنت دونوں شریعت کے ماخذ ہیں تو ہماری مراد اسی مفہوم میں سنت ہوتی ہے

لیکن سنت کے ایک معنیٰ اور بھی ہیں جو ان معنیٰ سے تھوڑا سا ہٹ کر ہیں، اور ان دونوں کو الگ الگ سمجھ لینا چاہئے۔ایک اصطلاح علمائے اصول کی ہے، ایک اصطلاح فقہائے اسلام کی ہے۔علمائے اصول کی اصطلاح وہ ہے جو ابھی میں نے عرض کی، یعنی رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا وہ طریقہ جس پر مسلمان عمل کرتے ہیں جو شریعت کے احکام کا ماخذ اور مصدر ہے۔

تیسرا مفہوم فقہا کے نزدیک وہ ہے جو آپ نے عام بول چال میں بھی سنا ہوگا کہ یہ دو رکعت سنت ہے، یہ تین رکعت فرض ہے، وہ تین رکعت واجب ہے۔واجب اور فرض کے مقابلے میں سنت کی جو اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ پہلے دو معنوں سے مختلف ہے۔یہاں سنت سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کا وہ حصہ جو لازمی اور واجب نہیں ہے، جو فرض و واجب نہیں ہے۔اس کو اگر اختیار کیا جائے تو اجر ملے گا اور نہ کیا جائے تو امید ہے کہ اللہ کے ہاں باز پرس نہیں ہوگی، یہ سنت کا تیسرا مفہوم ہے۔ان تینوں مفاہیم کو ذہن میں الگ الگ رکھنا چاہئے۔

سنت کی اقسام

سنت کی تین قسمیں ہیں۔یعنی سنت ہم تک تین طریقوں سے پہنچی ہے۔

۱۔ایک طریقہ تو ہے رسول اللہ ﷺ کے زبانی ارشادات گرامی کا جو صحابہ کرام نے سن کر بعینہ یاد کئے اور ہم تک پہنچائے۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی:

انما الاعمال بالنیات ، و انما لکل امرءٍ مانویٰ ، فمن کان ھجرتہ الی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ و رسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ و من کانت ھجرتہ الی الدنیا یصیبھا او الی امرأۃ یتزوجھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (۲)

بلا شبہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اور ہر ایک کے لئے وہی ہے، جس کی اس نے نیت کی ہے، سو جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اور اس کے رسول کے لئے ہی ہوگی، اور جس نے دنیا کے لئے ہجرت کی تو اسے دنیا ہی ملے گی، اور کسی عورت کے لئے ہجرت کی تو اس سے نکاح کرلے گا، سو اس کی ہجرت اس چیز کے لئے ہوگی، جس کی اس نے نیت کی ہے۔

یہ ایک مثال ہے سنت قولی کی، کہ آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ایک قول نکلا، صحابہ نے اسی طرح یاد کر کے دوسروں تک پہنچایا، دوسروں نے اس کو یاد کر کے آگے منتقل کیا اور یوں یہ ارشاد گرامی ہم تک پہنچ گیا۔ یہ سنت قولی یا حدیث قولی ہے۔

۲۔ سنت کی ایک قسم ہے سنت فعلی۔ صحابہ کرام نے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ یہ کیا کرتے تھے یا فلاں موقع پر آپ نے یہ کیا۔ سنت قولی وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ پر مشتمل ہو اور صحابہ کرام نے اسے بعینہ نقل کرلیا ہو۔ سنت فعلی یہ ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کا طرز عمل دیکھا اور اپنی زبان میں اپنے الفاظ میں بعد والوں کے لئے بیان کیا۔

۳۔ سنت کی تیسری قسم ''سنت تقریری'' ہے جس میں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی بیان ہوا ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی فعل یا عمل نقل ہوا ہے، لیکن دوسروں کا کوئی فعل یا عمل حضور کے سامنے ہوا اور آپ نے اس کی ممانعت نہیں فرمائی اور اس کو ناجائز نہیں قرار دیا، یہ بھی سنت ہے۔ اس طرح کی سنت سے بہت سے معاملات حدیث میں ثابت ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لائے تو عربوں میں بہت سے طور طریقے رائج تھے۔ بہت سے معاملات پر عرب لوگ کاربند تھے۔ ان معاملات اور طور طریقوں میں جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے خلاف دیکھا اس کی ممانعت فرمادی۔ جس چیز کو شریعت کے خلاف نہیں پایا، البتہ اس میں کوئی چیز قابل اصلاح تھی اس جز کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح فرمادی۔ اور جن معاملات میں کوئی بھی چیز قابل اعتراض نہیں تھی آپ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا وہ اسی طرح چلتی رہی۔ صحابہ کرام کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علم اور اطلاع سے اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ یہ بھی سنت تقریری ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ مضاربہ اور مشارکہ اسلام کے قانون تجارت کی دو اہم اصطلاحات ہیں۔ یہ کاروبار سے متعلق اسلام کے دو طریقے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں کاروبار کے یہ طریقے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن پاک نے کہیں مضاربہ کا حکم دیا ہے یا سنت میں کہیں مشارکہ کی ہدایت کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ قرآن پاک میں مضاربہ کا حکم ہے نہ سنت میں مضاربہ کا حکم ہے۔ اس کے اسلامی طریقہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منصب پر فائز ہوئے اور شریعت کے احکام نازل ہونا شروع ہوئے تو صحابہ کرام میں یہ دونوں طریقے رائج تھے۔ عرب میں اسلام سے قبل بھی مضاربہ اور مشارکہ پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ ان کے ہاں ان دونوں کے علاوہ بھی تجارت کے بہت سے طریقے رائج تھے۔ لیکن ہم ان میں سے دو کی مثال لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں جزوی ہدایات کے ذریعے اصلاح فرمائی۔ بقیہ طریقے اسی طرح قائم رہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ مضاربہ اور مشارکہ سنت تقریری سے ہمارے سامنے آئے ہیں۔

ایک اور مثال عرض کرتا ہوں۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت سفر پر روانہ ہوئی۔ وہاں ایک صاحب کو وضو کی ضرورت پیش آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ پانی نہیں ہے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لی۔ ایک دوسرے صاحب کو بھی وضو کی ضرورت پیش آئی، انہوں نے بھی تیمّم کر کے نماز ادا کر لی۔ تھوڑی دیر میں پانی دستیاب ہوگیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے، جنہوں نے تیمم کیا تھا، وضو کیا اور وضو کر کے نماز دہرالی۔ پہلے صاحب نے نماز نہیں دہرائی۔ اگلے دن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دونوں حضرات نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ میں نے تیمم کر کے نماز پڑھ لی تھی، چوں کہ شریعت نے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے اس لئے میری نماز ہوگئی تھی، لہٰذا نماز کو دہرانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے صاحب نے عرض کیا کہ میں نے سوچا کہ نماز کا وقت موجود ہے اور پانی مل گیا ہے اور وضو تیمم سے زیادہ افضل ہے، اس لئے میں نے وضو کر کے نماز دہرالی۔ آپ نے پہلے صاحب کو جواب دیا:

لقد اصبت السنة

تم نے سنت کے مطابق عمل اختیار کیا۔

اور دوسرے صاحب سے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لك الاجر مرتين (۳)

تمہیں دوہرا اجر ملے گا۔

گویا آپ نے دونوں حضرات کے اس نقطہ نظر کو پسند فرمایا اور جائز قرار دیا، اس لئے اب یہ سنت ہوگیا۔ سنت سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جس شخص کو پانی دست یاب نہ ہو اور وہ وضو کے بہ جائے تیمم کر کے نماز پڑھ لے تو یہ کافی ہے۔ دوبارہ پانی ملنے کے بعد دہرانا ضروری نہیں۔ لیکن اگر کوئی دہرا لے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ حدیث میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ سنت تقریری سے کوئی چیز کیسے ثابت ہوتی ہے؟

قرآن میں سنت کی سند

اس دور میں بعض حضرات کا یہ کہنا بہت بڑی گم راہی ہے اور اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے کہ جو چیز سنت کی صورت میں مسلمانوں کے پاس اس وقت موجود ہے اس کی کوئی سند قرآن پاک میں موجود نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک بہت بڑی گم راہی ہے بل کہ ایک بہت بڑی فضیلت سے محرومی کی بات بھی ہے۔ اگر صرف قرآن مجید یا کوئی تحریری نوشتہ رہ نمائی اور ہدایت کے لئے کافی ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو انبیاء بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، آسمانی کتابیں اتار دی جاتیں اور اسی پر اکتفا کیا جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے گئے، جن میں سے کچھ پر کتابیں بھی اتاری گئیں، کتابوں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک روایت میں ایک سو چار کتابوں کی تعداد بیان ہوئی ہے، ایک دوسری روایت سے تین سو چودہ کتابوں کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہے۔ گویا اصل چیز نبی اور پیغمبر ہے، کتاب کا اتارا جانا یا نہ اتارا جانا اللہ کی مشیت پر ہے، جب مناسب سمجھا اس نے کتاب نازل فرمائی، اور جب مناسب نہیں سمجھا کتاب نازل نہیں فرمائی۔ اس لئے نبی اور پیغمبر کو اور ان کی رہ نمائی کو کتاب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں خود کتاب اللہ یعنی اللہ کی کتاب قرآن مجید میں درجنوں مقامات پر وہ ہدایات موجود ہیں جن میں پیغمبر کی سنت اور اس کی تفسیر و تشریح کو قرآن مجید کے سمجھنے اور اس پر عمل درآمد کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الا انی اوتیت الکتاب ومثله معه، الا انی اوتیت القرآن ومثله معه (۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یادرکھو مجھے کتاب بھی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا گیا ہے۔ یادرکھو مجھے قرآن مجید بھی دیا گیا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی بہت کچھ دیا گیا ہے۔

یعنی قرآن سے ملتی جلتی اور بھی بہت سی ہدایات اور رہ نمائی عطا فرمائی گئی ہے۔ لہذا یہ دونوں قسم کی رہ نمائی للہ کی طرف سے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا ہوئی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی کم وبیش چوبیس ہزار مرتبہ ہوا۔ بہ ظاہر چوبیس ہزار مرتبہ اگر وحی نازل ہوئی ہو اور قرآن پاک کی ایک ایک آیت ایک مرتبہ بھی نازل ہو، اگر چہ بعض مرتبہ لمبی لمبی سورتیں ایک ہی مرتبہ کی وحی میں نازل ہوئیں، سورۃ انعام پوری ایک ہی وقت میں نازل ہوئی۔ سورۃ یوسف پوری ایک وقت میں نازل ہوئی۔ مکّی سورتیں اکثر چھوٹی چھوٹی ایک ایک وقت میں نازل ہوئیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ چار پانچ سو مرتبہ کر کے پورا قرآن مجید نازل ہوسکتا تھا۔ یہ چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہونے کا کیا مفہوم ہے؟

امام ابوداؤد نے اپنی کتاب سنن میں روایت کیا ہے:

كان جبريل عليه السلام ينزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم بالسنة كما ينزل عليه بالقرآن، ويعلمه اياها كما يعلمه القرآن(۵)

جبرئیل امین سنت لے کر بھی اسی طرح اترتے تھے جس طرح کہ قرآن مجید لے کر اترتے تھے۔ اور جیسے آپ کو قرآن سکھایا کرتے تھے اسی طرح سنت بھی سکھایا کرتے تھے۔

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ چوبیس ہزار مرتبہ جو نزول وحی ہوا اس میں قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت کا نزول بھی شامل ہے۔ اور جبرئیل امین نے سنت کے بنیادی احکام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچائے۔

اس لئے علم حدیث جو سنت کا سب سے بڑا ماخذ اور سب سے بڑا مصدر ہے اس کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے اور اس کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے کہ یہ علم سنت کو بیان کرتا ہے۔ سنت کی تفصیلات علم حدیث کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں۔ سنت کا تحفظ اور سنت کی بقا کی ہر کاوش مسلمانوں کے لئے اسی طرح لازمی ہے اور بہت اونچی فضیلت رکھتی ہے جس طرح قرآن مجید کا تحفظ اور اس کی بقا کی کاوش ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کا تو اللہ نے وعدہ کیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ O(٦)

بلا شبہ ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔

لیکن اس وعدے کی جزوی تطبیق سنت پر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں ذکر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ذکر میں قرآن مجید شامل ہے۔ لیکن ذکر یعنی یاد دہانی اسی وقت یاد دہانی ہو سکتی ہے جب اس کا مفہوم سامنے ہو۔ اگر کوئی یاد دہانی ہو لیکن اس کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آئے، مثلاً کوئی شخص آپ کو کسی پرانی زبان میں یاد دہانی کا خط بھیج دے، پرانی سریانی یا رومن یا لیٹن زبان میں آپ کو خط لکھے اور آپ کو وہ زبان نہ آتی ہو تو یاد دہانی بے معنیٰ ہے۔ یاد دہانی اسی وقت بامعنیٰ ہوگی جب آپ کی سمجھ میں آئے۔ اس لئے اگر قرآن مجید کی تشریح اور توضیح موجود نہیں ہے تو یاد دہانی اور اس کے اثرات محدود ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یاد دہانی کو محفوظ رکھنے کے لئے جہاں اس کے متن کا تحفظ ضروری ہے وہاں اس کی تشریح و تعبیر کا تحفظ بھی ضروری ہے۔ اور وہ تشریح و تفسیر کا تحفظ سنت کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت مسلمہ کو تلقین فرمائی کہ سنت کے تحفظ اور بقا کے لئے بھی اسی طرح کوشش کریں جیسے قرآن پاک کے تحفظ اور بقا کے لئے کرتے ہیں۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا:

المتمسك بسنتي عند فساد امتي له اجر شهيد (٧)

وہ شخص جو میری سنت کا دامن پکڑے ہوئے ہے، اس وقت جب میری امت فساد کا شکار ہو تو اس کے لئے شہید کا اجر ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ **له اجر مأة شهيد** یعنی اس کو سو شہیدوں کا اجر ملے گا۔

سو شہیدوں کا اجر اس لئے ملے گا کہ ایک شہید جس مقصد کے لئے جان قربان کرتا ہے وہ کیا ہے؟ وہ اسلام کی بقا اور اسلام کا تحفظ ہے، امت مسلمہ کا تحفظ ہے۔ اگر خدانخواستہ سنتیں مٹ رہی ہوں، حدیث ختم ہو رہی ہو تو پھر امت مسلمہ کا وجود دینی بنیادوں پر باقی نہیں رہ سکے گا۔ تو جن مقاصد کی خاطر شہید اپنی جان قربان کرتا ہے سنت کا تحفظ کرنے والا ان ہی مقاصد کو دوسرے انداز سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اس کو ایک شہید یا سو شہید کا اجر ملے گا۔ مختلف اسباب اور نیتوں کے لحاظ سے دونوں اپنے اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔

امام شافعی نے لکھا ہے کہ علمائے حدیث اور علمائے سنت کی اپنے اپنے علاقے اور زمانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں وہی حیثیت ہے جو صحابہ کرام اور تابعین کی اپنے دور میں تھی۔ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کو ان کے دور میں عزت واحترام کیوں حاصل تھا؟ اس لئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی رہ نمائی لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ان کے ذریعے لوگوں تک پہنچ رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا علم ان کے ذریعے پھیل رہا تھا۔ لہٰذا آج ایک صاحب علم جو حدیث اور سنت کا علم رکھتا ہو اور اس کے ذریعے یہ علم لوگوں تک پہنچ رہا ہو تو گویا وہ وہی کردار ادا کر رہا ہے جو صحابہ کرامؓ اور تابعین اپنے زمانے میں ادا کیا کرتے تھے۔ اسی لئے امام شافعی نے ایک جگہ فرمایا ہے:

اهل الحديث في كل زمان كالصحابة في زمانهم

علمائے حدیث کی ہر زمانے میں وہی حیثیت ہوگی جو صحابہ کرام کی اپنے زمانے میں تھی۔

ایک جگہ انہوں نے فرمایا:

اذا رأيت صاحب حديث فكاني رأيت احدا من اصحاب الرسول صلى الله عليه وسلم

اگر میں حدیث کے کسی عالم کو حدیث بیان کرتے ہوئے دیکھوں (اور خود امام شافعی ان میں شامل تھے) تو گویا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابیؓ کو دیکھا (جو علم حدیث بیان کر رہے تھے)۔

یہ حدیث اور سنت کی دینی اور اسلامی اہمیت اور ضرورت ہے۔ اس پر ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی جو قرآن پاک کی شکل میں ہمارے پاس ہے۔ اس میں بنیادی ہدایات اور کلیات بیان ہوئی ہیں، لیکن ان ہدایات کا جو کتاب الٰہی میں بیان ہوئی ہیں جب تک عملی تشکل نہ ہو اس وقت تک ان ہدایات پر عمل درآمد بڑا دشوار ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حدیث اور سنت کی رہ نمائی کے بغیر ان ہدایات پر عمل درآمد ممکن نہیں ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

حدیث کے مقابلے میں دیگر مذاہب کے صحائف کی حیثیت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سابقہ آسمانی کتابوں کو دیکھیں۔ آج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ناپید ہے۔ ان پر اتارے جانے والے صحیفے ناپید ہوگئے۔ ان کے ارشادات ہمارے علم میں نہیں ہیں۔ ان کی سنت کے بہت معمولی اور مبہم سے آثار ہیں، جو اس لئے محفوظ رہ گئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں وہ شامل ہوگئے، عرب میں ان کا رواج تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے ان کو شریعت کا حصہ بنا دیا۔ اس لئے وہ آج محفوظ ہیں ورنہ وہ اتنے بھی محفوظ نہ رہتے۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ماننے والے آج کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ ان کی ایک ریاست بھی موجود ہے۔ جس کے پاس بڑے بڑے وسائل ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت موجود ہے کہ نہیں ہے۔ ان کے ارشادات موجود ہیں کہ نہیں ہیں۔ اس کے بارے میں یہودی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ان کے پاس جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام سے منسوب ہے وہ ایک انتہائی غیر مستند، مبہم اور غیر تاریخی چیز ہے۔ مختلف انداز سے اس کو مرتب کیا گیا ہے۔ لیکن کوئی یہودی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام ہی کے ارشادات گرامی ہیں۔

یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ آج یہ چار انجیلیں ان کے ارشادات کا سب سے بڑا ماخذ مانی جاتی ہیں۔ اناجیل اربعہ کا نام آپ نے سنا ہوگا، جو عیسائیوں کے نزدیک مستند ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشادات جگہ جگہ بیان کئے گئے ہیں۔ ان کی سیرت بیان ہوئی ہے۔ لیکن اگر آپ تاریخ کے ایک ایسے طالب علم کے نقطہ نظر سے دیکھیں جو چیزوں کو میرٹ پر جاننا چاہتا ہو اور محض کسی عقیدت مندی کی بنیاد پر چیزوں کو نہ مانتا ہو تو آپ کو پتہ چلے گا کہ تاریخی اعتبار سے ان بیانات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اول تو وہ بیانات اتنے مبہم ہیں جس کی کوئی حد نہیں، اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ اگر کوئی ان کی فہرست بنانا چاہے تو ان کی تعداد شاید تیس یا چالیس پچاس سے زیادہ نہیں بن سکتی۔ پھر اگر ان بیانات کو درست مان بھی لیا جائے تو ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس معاملے میں عیسائی مؤرخین بھی خاموش ہیں اور دنیا کے دوسرے مؤرخین بھی خاموش ہیں۔ جن لوگوں نے ان اناجیل کو بیان کیا ان میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا معاصر نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کو کس نے سب سے پہلے بیان کیا؟ کس زبان میں بیان کیا؟ کس جگہ بیٹھ کر اس کو مرتب کیا۔ پہلے پہل اناجیل کا جو نسخہ مرتب کیا گیا تھا وہ کہاں ہے؟ ان میں سے کوئی چیز آج موجود نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے تشریف لے جانے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساٹھ، ستر یا پچھتر سال بعد کچھ لوگوں نے یہ چیزیں لکھیں۔ان ابتدائی تحریروں میں سے کوئی چیز بھی تحریری شکل میں آج موجود نہیں ہے۔ان میں سے ایک نسخے کا بعد میں کسی شخص نے ترجمہ کیا تھا۔وہ ترجمہ کرنے والا کون تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔وہ اس زبان کو جانتا تھا جس میں انجیل پہلے پہل لکھی گئی یا نہیں جانتا تھا؟ یہ بھی معلوم نہیں۔اس نے صحیح ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم، مکمل ترجمہ کیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔اپنی طرف سے کچھ ملا دیا؟ یہ بھی نہیں معلوم۔کچھ چیزیں حذف کردیں؟ یہ بھی نہیں معلوم۔اس نے ترجمہ کر کے چھوڑ دیا۔وہ ترجمہ دوڈھائی سو سال بعد کہیں سے دریافت ہوا اور اس غیر مستند ترجمے کے یہ سارے ترجمے ہیں جو آج عہد نامہ جدید کی پہلی چار کتابوں کی صورت میں موجود ہیں۔یہ اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت ہے

اس کے مقابلے میں آپ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیں کہ اگر آج میں آپ سے یہ بیان کروں کہ یہ حدیث مبارک جو ابھی میں نے پڑھی انما الاعمال بالنیات و انما لکل امری مانویٰ تو میں آپ سے بیان کر سکتا ہوں کہ مجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کی۔اس سے کس نے بیان کی اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس حدیث کی پوری سند آپ کو سنا سکتا ہوں۔مسلمانوں کے علاوہ دنیا میں کسی اور کے پاس ایسی کوئی چیز موجود نہیں۔دنیا کے لئے یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ایسی کوئی چیز بھی ہوسکتی ہے؟ حضرت عیسیٰؑ تو بہت پہلے تھے،آج سے سو دو سو سال پہلے کے کسی آدمی کا بیان اس سند کے ساتھ موجود نہیں کہ سند میں شامل ہر آدمی ایک تاریخی وجود رکھتا ہو اور آپ کو اختیار ہو کہ ہر ایک کے بارے میں پوچھیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ اور میری ذمے داری ہو کہ میں تاریخ سے ثابت کروں کہ یہ فلاں صاحب تھے،فلاں جگہ پیدا ہوئے تھے یہ ان کا نام تھا اور یہ ان کا کارنامہ ہے۔یہ چیز دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے،یہ صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔

کتاب الٰہی اور ارشادات انبیاء میں بنیادی فرق

اب وحی الٰہی کی طرف آتے ہیں۔وحی الٰہی کا ایک خاص اسلوب ہے۔قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب ہے تورات میں بھی یہ اسلوب ملتا ہے، جو حصے تورات کے مستند باقی رہ گئے۔اور جس حد تک انجیل میں استناد پایا جاتا ہے، انجیل میں بھی یہ بات موجود ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی باتوں کو عمومی انداز میں بیان فرماتے تھے۔کتاب الٰہی کے عمومی اصول ہوتے ہیں۔اس میں عملی تفصیلات اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روزمرہ کے احکام نہیں ہوتے۔اگر ایسا ہونے لگے تو کتاب الٰہی کی کم از کم سو جلدیں ہوں۔قرآن مجید کی سو جلدیں ہوتیں اگر یہ سب کچھ قرآن مجید میں لکھا جاتا کہ نماز میں ہاتھ یہاں باندھو، رفع یدین کرو یا مت کرو، نماز میں کیا پڑھو، کیسے پڑھو۔صرف نماز کے احکام اگر قرآن پاک میں لکھے جاتے تو موجودہ قرآن پاک سے شاید دس گنا زیادہ اس کی جلدیں بن جاتیں۔پھر لوگ اس کو یاد کیسے رکھتے اور سمجھتے کیسے۔اس لئے قرآن مجید کا، ملوب یہ ہے کہ اس میں عمومی ہدایات اور عمومی اصول بیان کئے گئے ہیں۔ایسے ہی عمومی اصول توراۃ میں ہیں۔یہی عمومی اصول انجیل میں ہیں۔یہی بقیہ کتابوں میں ہیں۔

اب اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے دینے کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کو دنیا میں بھیجا کہ ان کی سنت کو دیکھتے جاؤ اور عمل سیکھتے جاؤ۔اگر کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے کہ عدل و انصاف سے کام لو تو جو ان کا طرز عمل ہے وہ عدل و انصاف ہے، اس کے مطابق کام شروع کر دو۔اگر اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو تو جیسے یہ عبادت کرتے ہیں ویسے عبادت شروع کر دو۔اس طرح سے کتاب الٰہی کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ انبیاء علیہم السلام کے سال ہا سال کی سنتوں کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔وہ ایک زندہ پائندہ وجود ہے۔لوگ اس کو دیکھتے جائیں اور کتاب الٰہی پر عمل درآمد کرتے جائیں۔

سنت: وحی الٰہی کا عملی نمونہ

سابقہ انبیاء علیہم السلام کی اقوام نے ان کی سنتوں کو بھلا دیا۔محفوظ بھی نہیں رکھا اور جتنا کچھ باقی رہا تھا اس کو بھی بھلا دیا اور یاد نہیں رکھا۔اب صورت یہ ہے کہ ان کے ہاں صرف نعرے اور اعلانات ہیں۔عمل درآمد نہیں ہے۔میں ایک مثال آپ کو دیتا ہوں۔عیسائیوں کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دو اصولوں کی تعلیم دی گئی ہے اور ہم دو ہی اصولوں کے علم بردار ہیں۔عدل و انصاف اور انسانیت سے محبت۔عیسائیوں کی کتابوں میں اکثر جگہ آپ نے یہی لکھا دیکھا ہوگا۔لیکن یہ بات کہ انسانیت سے محبت سے کیا مراد ہے؟ اس پر عمل درآمد کیسے کیا جائے گا؟ عدل و انصاف کی تعریف کیا ہے؟ اس کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ جب تک عملی تشکیل کر کے لوگوں کی رہ نمائی نہ کی جائے کہ عدل کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت تک عدل کا لفظ بے معنیٰ ہے۔میں پوری زندگی تقریریں کرتا رہوں کہ عدل ہونا چاہئے۔نہ میری زندگی میں عدل ہو، نہ آپ کی زندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں عدل ہو، تو یہ تقریری بے معنیٰ ہے۔ یہ بات کہنے میں تو بہت اچھی لگتی ہے کہ کوئی تمہارے دائیں گال پر چانٹا مارے تو تم بایاں گال بھی سامنے کر دو۔ کہنے کو تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اس کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیا بعض صورتوں میں استثنا بھی ہوگا یا ہر حالت میں ایسا کرنا چاہئے؟ کیا کسی قاتل کے سامنے جب وہ تلوار سے وار کرے تو دوسرا کندھا بھی سامنے کر دیں کہ ادھر بھی وار کر دو کہ یہی انجیل کا حکم ہے۔ چور ایک کمرے میں ڈاکہ ڈالے تو آپ دوسرا کمرہ بھی کھول دیں کہ یہاں بھی ڈاکہ ڈال دو۔ سوال یہ ہے کہ اس اصول پر کہاں عمل درآمد کریں گے اور کہاں نہیں کریں گے؟ کیسے عمل کریں گے؟ جب تک یہ تفصیل سامنے نہ ہو اس وقت تک یہ نعرہ محض ایک بے معنیٰ بات ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سنت ان لوگوں نے محفوظ نہیں رکھی، گم کر دی ہے۔ لہٰذا ان کے پاس سوائے اس مبہم نعرے کے اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سنت یہودیوں نے مٹا دی۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اپنے پڑوسی کے لئے وہی کرو جو اپنے لیے کرتے ہو، لیکن کیا یہودی اپنے پڑوسیوں کے لئے وہ کچھ کرتے ہیں جو کچھ اپنے لئے کرتے ہیں؟ آپ دیکھ لیجئے کیا ہو رہا ہے؟ اسرائیل میں کیا کر رہے ہیں، باقی جگہوں میں کیا کر رہے ہیں؟ اس لئے کہ یہ نعرہ تو لکھا ہوا ہے۔ توراۃ میں اس موضوع پر ایک آدھ سطر کی تعلیم ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد کے لئے اس کے پیچھے کوئی سنت اور طرز عمل نہیں ہے۔

جو بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سنت میں وحی الٰہی کی ایک عملی تشکیل فراہم کی گئی ہے۔ ایک جیتا جاگتا عملی نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے جس میں وحی الٰہی کے ایک ایک حکم، ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کی پوری نقشہ کشی کر دی ہے کہ اس پر عمل درآمد ایسے ہوگا۔ اب کسی لفظ کے بارے میں کوئی ابہام نہیں ہے کہ قرآن مجید میں کوئی لفظ کس لیے اختیار کیا گیا ہے؟ اور اس میں کیا کہا گیا ہے؟

اگر سنت کا یہ کارنامہ نہ ہوتا تو قرآن مجید کے اصول صرف نظری بیانات اور خوش گوار اعلانات ہوتے۔ قرآن مجید کے اعلانات بھی نعوذ باللہ مجرد اعلانات بن کر رہ جاتے۔ جیسے توراۃ اور انجیل کے اعلانات محض لفظی بیانات ہو کر رہ گئے ہیں۔ جیسے بقیہ مذہبی کتابوں میں اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ جس قوم کی بھی مذہبی کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں بڑے اچھے اخلاقی اصول بیان ہوئے ہیں۔ لیکن عمل درآمد کا معاملہ صفر ہے۔ وہ اس لئے صفر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی عملی نمونہ نہیں ہے۔ عملی نمونے بلاشبہ موجود تھے، اللہ نے بھیجے تھے، لیکن ان کے ماننے والوں نے ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عملی نمونوں کی تفصیلات باقی نہیں رکھیں۔عدل، محبت، مساوات، کرامت آدم یہ سارے اعلانات جوقرآن مجید میں کیے گئے ان کی عملی تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

قرآن مجید میں اللہ رب العزت نے کتاب الٰہی کو محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔اور مشاہدہ بھی یہ ہے کہ قرآن مجید وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو آج تک بعینہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح اللہ رب العزت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ تک پہنچائی۔اس میں ایک حرف، ایک شوشے اور ایک زبر زیر کا بھی فرق نہیں ہے۔حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس طرح لکھی آج تک اسی طرح لکھی جارہی ہے۔چناں چہ ملاحظہ کیجئے کہ ایک جگہ لکھا جاتا ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۸)

ایدٍ میں دو''ی''لکھی جاتی ہیں اور ایک''ی''پڑھی جاتی ہے۔دو''ی'' کیوں لکھی جاتی ہیں، کسی کو نہیں معلوم۔صرف یہ معلوم ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جب قرآن پاک لکھا تھا تو یہ لفظ دو ی سے لکھا تھا بس آج تک اسی کی پیروی ہورہی ہے۔ایک جگہ ہے سترھویں پارے میں وَكَذٰلِكَ نُـجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۹) میں دو نون پڑھے جاتے ہیں ایک لکھا جاتا ہے، دوسرا نہیں لکھا جاتا۔بعد میں پڑھنے والوں کی آسانی کے لئے اس کے اوپر ایک چھوٹے نون کے لکھنے کا رواج ہوگیا۔لیکن یہ حرف آج تک اسی طرح لکھا جاتا ہے۔یہ اس لئے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے اسی طرح لکھا تھا۔

اس طرح کی مثالیں قرآن پاک میں اور بھی ہیں۔جن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ کتاب الٰہی کے متن کے ساتھ ساتھ اس کا املا اور ہجا بھی محفوظ ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی کے تحفظ کے لئے اللہ رب العزت نے دس چیزوں کا تحفظ کیا۔یہ دس چیزیں وہ ہیں جو قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ کی گئی ہیں۔

۱۔سب سے پہلے تو خود قرآن پاک کا متن ہے جو ہماری اس وقت کی گفت گو کے موضوع سے باہر ہے۔بہ ہر حال یہ ایک قطعی امر ہے کہ قرآن پاک کا متن پوری طرح سے محفوظ ہے۔

۲۔پھر متن محفوظ ہو اور معنیٰ اور مفہوم محفوظ نہ ہو تو متن کی حفاظت سے فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔پرانے زمانے میں اسلام آباد کے علاقے میں پراکرت زبان بولی جاتی تھی، پراکرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبان ہو یا اردو ہی گورمکھی رسم الخط میں لکھی ہو تو ہمارے اور آپ کے لئے بے کار ہے۔ دو سو سال پرانا متن ہو، ہزار سال پرانا ہو یا دو ہزار سال پرانا ہو، وہ ہمارے لیے بے معنیٰ ہے۔ اس لئے کہ اس کے معنیٰ اور مفاہیم مٹ گئے۔ اس کے برعکس اللہ نے قرآن پاک کے متن کو بھی محفوظ رکھا اور اس کے معنیٰ کو بھی محفوظ رکھا جو سنت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور ہماری اس گفت گو کا موضوع ہے۔

۳۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید کی زبان کو بھی محفوظ رکھا۔ قرآن مجید کی زبان بھی محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی ہم عصر سب زبانیں مٹ گئی ہیں۔ جن جن زبانوں کو نزول قرآن کے زمانے میں انسان بولتے تھے آج ان میں سے کوئی زبان دنیا میں محفوظ نہیں ہے، صرف ایک قرآن مجید کی زبان موجود ہے۔ یہ ایک ایسا عجیب وغریب استثنا ہے جس کی لسانیات کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ دنیا کی ہر زبان تین چار سو سال بعد بدل جاتی ہے۔ آج میں جو اردو بول رہا ہوں یہ اردو آج سے چار سو سال پہلے نہیں بولی جاتی تھی۔ تین سو سال کے بعد نہیں بولی جائے گی۔ تین سو سال بعد آنے والے شاید اس زبان کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ لیکن عربی زبان واحد زبان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ سے کم وبیش ساڑھے تین سو سال پہلے سے بولی جارہی تھی۔ اس کی مثالیں موجود ہیں، رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی عربی زبان کے نمونے موجود ہیں اور آج ہم تک پہنچے ہیں، اور ان میں یہی اسلوب، یہی الفاظ اور یہی لغت استعمال ہوئی ہے جو احادیث اور قرآن پاک میں ہمیں ملتی ہے۔

۴۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور سنت پر جو اجتماعی عمل مسلمانوں کا رہا ہے، جسے تعامل کہتے ہیں یعنی نسلاً بعد نسلٍ لوگ عمل کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ بھی پوری طرح محفوظ ہے۔ جس کا نہ صرف مسلمانوں کے اجتماعی طرز عمل سے بل کہ مسلمانوں کے بعض دست یاب مطبوعہ ریکارڈ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ تعامل کس زمانے میں کیسا تھا۔

ایک مثال میں عرض کردیتا ہوں۔ قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ درجنوں نہیں سینکڑوں جگہ آیا ہے کہ نماز قائم کرو لیکن کہیں بھی نماز کی تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے احکام اور طریقہ کار کو بیان فرمایا اور آپ اس تفصیل میں نہیں گئے کہ یہ فرض ہے، اور یہ واجب ہے، آپ نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا فرمایا:

صلّوا کما رائیتمونی اصلی (۱۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو اسی طرح نماز پڑھنی شروع کردو

صحابہؓ نے اس طرح نماز پڑھنی شروع کردی۔ صحابہ نے آگے تابعین کو سکھایا، تابعین نے تبع تابعینؒ کو سکھایا اور ہر دور میں فقہائے اسلام اور محدثین اور مفسرین قرآن نماز کے احکام کی تفصیلات بیان کرتے رہے۔ آج مسلمان اربوں کی تعداد میں نماز ادا کررہے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں مسلمان باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں۔ اگر آپ کو یہ جاننے کا شوق ہو کہ کس دور میں مسلمان نماز کس طرح پڑھتے تھے تو اس دور کی کوئی کتاب، فقہ کی، حدیث کی یا تفسیر کی دیکھ لیں، معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان بارہویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ ساتویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے۔ نویں صدی ہجری میں ایسے کرتے تھے، اگرچہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج جس طرح کررہے ہیں یہ تعامل سے ثابت ہے۔ لیکن مزید چیک کرنا چاہیں تو یہ سارا ذخیرہ موجود ہے اس کو جانچا جا سکتا ہے۔ یہ تحفظ تعامل ہے جو قرآن مجید کے تسلسل کے لئے ضروری ہے۔

۵۔ پھر جس ماحول اور جس سیاق وسباق میں قرآن مجید نازل کیا گیا اس ماحول اور سیاق وسباق کی پوری تفصیل حدیث کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ سیرت اور حدیث کے ذخائر میں اس پورے ماحول کی منظر کشی اور نقشہ کشی کر کے ہمارے سامنے رکھ دی گئی جس میں قرآن مجید نازل ہوا۔ جب حدیث کا ایک طالب علم حدیث کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ سیرت کا طالب علم سیرت کی تفصیلات پڑھتا ہے تو اس کے سامنے چشم تصور میں وہ سارا منظر متشکل ہو کر آجاتا ہے جس میں قرآن پاک نازل ہوا، جس پس منظر اور پیش منظر میں قرآن پاک کے احکام و ہدایات پر عمل درآمد شروع ہوا اور ایسی چیزیں جن کا بظاہر قرآن پاک یا حدیث پاک کے سمجھنے سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، وہ تفصیلات بھی صحابہ کرامؓ نے بیان کردیں اور ان کو محفوظ کردیا۔

ایک قسم حدیث کی کہلاتی ہے حدیث مسلسل۔ اس سے مراد وہ حدیث ہے جس میں ہر راوی نے کوئی خاص نقطہ یا کسی خاص کیفیت کے تسلسل کے ساتھ روایت کو بیان کیا ہو، اس کو حدیث مسلسل کہتے ہیں۔ چناں چہ ایک حدیث کہلاتی ہے حدیث مسلسل بالتشبیک تشبیک دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اس طرح ایک دوسرے کے اندر پرو لینا، اس عمل کو تشبیک کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرمارہے تھے اور بیان فرمارہے تھے کہ جب انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے دل سے ایمان اس طرح نکلتا ہے، اور جب توبہ کرلیتا ہے تو ایمان دل میں ایسے داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر پرو کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بتایا۔ جب صحابیؓ نے اس کو نقل کر کے بتایا تو انہوں نے بھی ایسے کیا، آپ نے دونوں انگلیوں کو پرو کر علیحدہ کیا اور کہا کہ ایمان اس طرح نکل جاتا ہے۔ پھر چوری کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے، پھر فلاں عمل کرتا ہے تو ایسے نکلتا ہے۔ پھر توبہ کرتا ہے تو داخل ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو حدیث مسلسل بالتشبیک کہا جاتا ہے۔ اور صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک اس حدیث کو بیان کرنے والے اس عمل کی نقل کر کے بتاتے ہیں۔ اس عمل کو کر کے دکھانے اور بتانے کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر کوئی نہ بھی کرے تو بھی بات سمجھ میں آ جائے گی۔ لیکن اس سے ایک اضافی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ نفسیاتی اور جذباتی طور پر انسان اس ماحول میں چلا جاتا ہے جس ماحول میں رسول اللہ ﷺ اس بات کو بیان فرما رہے تھے اور روحانی طور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں وہاں موجود ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کو صحابہ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور حدیث کے طلباء اور اساتذہ کے ذریعے میں دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ یہ ہے تحفظ ماحول کی ایک مثال۔ اس طرح کی مثالیں اور بھی سامنے آئیں گی، یعنی وہ پوری کیفیت جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی حدیث ارشاد فرمائی یا سنت کا کوئی نمونہ لوگوں کے سامنے رکھا اور قرآن مجید کی تعبیر و تشریح فرمائی تو اس ماحول کی تفصیلات کو بھی اللہ نے محفوظ اور باقی رکھا ہے۔

۶۔ جو شخصیت کتاب الٰہی لے کر آئی وہ اپنی جگہ خود ایک سمندر ہے، ایک موضوع ہے۔ حاملِ کتابِ الٰہی کی سیرت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی طرح محفوظ رکھا کہ جس سے زیادہ کسی انسان کی شخصیت کی تفصیلات کو محفوظ رکھنے کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۷۔ انسان کے حاشیۂ خیال میں وہ امکانات اور تفصیلات نہیں آ سکتیں جو سیرت کے واقعات کو محفوظ رکھنے کے لئے کی گئیں۔ زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں لیکن ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ عربوں کے دل میں اللہ تعالیٰ نے یہ ڈالا اور بظاہر ہمارے خیال میں اسی لئے ڈالا کہ سیرت کے واقعات محفوظ رکھنے تھے، کہ اپنے قبائل اور برادریوں کے نسب کو محفوظ رکھیں۔ علم الانساب ان کے ہاں ایک باقاعدہ فن تھا۔ علم الانساب کے نام سے ان موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں کہ عرب قبائل کا نسب کیا تھا؟ کون کس کا بیٹا تھا، کس کا پوتا تھا، کس کا دادا تھا، کس کی شادی کہاں ہوئی، کس کی کتنی اولادیں تھیں، کس قبیلے کی آپس میں کیا رشتہ داریاں تھیں۔ ان معلومات پر درجنوں کتابیں آج بھی دستیاب ہیں جو لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھیں۔

اب کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عربوں کو ان موضوعات سے دلچسپی تھی، ان دو چیزوں پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معلومات جمع کرنے کا شوق تھا، اس لئے انہوں نے انساب پر کتابیں لکھ دیں۔ لیکن محض یہ کہنا کافی نہیں ہے۔ جب ہم انساب کی ان کتابوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک عجیب وغریب بات سامنے آتی ہے،۔ اتنی عجیب وغریب کہ اس کو محض اتفاق نہیں کہا جاسکتا۔ وہ بات یہ ہے کہ جتنی معلومات محفوظ ہوئیں وہ مرکوز ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر، حال آں کہ جس وقت سے محفوظ ہونا شروع ہوئیں اس وقت تو حضور ﷺ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ چالیس سال تک کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ نبی ہوں گے اور نبوت کا سلسلہ اس طرح چلے گا اور پھر ایک امت قائم ہوگی اور اس امت میں علوم وفنون کے بہت سے سلسلوں میں سے ایک سلسلہ یہ چلے گا کہ انساب کے بارے میں یہ معلومات جمع کی جائیں گی، یہ تو کبھی کسی کے تصور میں بھی نہیں آیا تھا۔ لیکن عربوں نے اپنے اپنے طور پر جو معلومات جمع کیں اور جو بعد میں کتابی شکل میں مدوّن ہوئیں اور آج جس طرح ہم تک پہنچیں، وہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت مبارکہ پر مرکوز ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آپ کے پینتیسویں چالیسویں جدِ امجد عدنان تک اہم اور بنیادی امور سے متعلق ہر ایک چیز محفوظ ہے۔ آپ ﷺ کی دادیاں کون تھیں، نانیاں کون تھیں، پھوپھیاں کون تھیں۔ یہ سب معلومات علم انساب کی کتابوں میں ملیں گی۔ مثال کے طور پر میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ کی دادی کا نام کیا تھا تو شاید آپ بتا دیں۔ آپ میں سے اکثر بتا دیں گے۔ اگر میں یہ پوچھوں کہ دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید آپ میں سے دس فیصد بتا سکیں اور اگر میں پوچھوں کی دادی کی دادی کی دادی کا کیا نام تھا تو شاید ہم میں سے کوئی بھی نہ بتا سکے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ اسی طرح میری یا آپ کی نانی کا کیا نام تھا، سب بتا دیں گے۔ نانی کی نانی کا نام شاید دو چار بتا سکیں۔ نانی کی نانی کی نانی کا کیا نام تھا شاید کوئی بھی نہیں بتا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عجیب وغریب بات ہے آپ کے اجداد، آپ کی دادیاں، آپ کی نانیاں، آپ کے نانا اور آگے آپ کی پھوپھیاں اور آگے۔ آپ کے چچا اور آگے ہر ایک تفصیلات پچیس پچیس اور تیس تیس نسلوں تک محفوظ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ ابوجہل، ابولہب کی محفوظ نہیں ہیں، خالد بن ولیدؓ کی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ اسلام سے پہلے عرب کے بڑے بڑے لوگ تھے، ان ہی کا چرچا تھا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں اس طرح کی معلومات محفوظ نہیں رہیں۔ جو معلومات محفوظ رہ گئیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں محفوظ رہ گئیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص مشیت سے عربوں کے دل میں یہ ڈالا کہ وہ نسب محفوظ رکھیں اور جس نسب کو عربوں نے زیادہ اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھا، یہ وہ تھا جس کا رشتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالواسطہ یا بلا واسطہ ملتا تھا۔ سیرت کے واقعات کے محفوظ رکھے جانے کی ایسی ایسی مثالیں ہیں کہ جن کی تفصیلات میں اگر میں جاؤں تو گفت گو موضوع سے آگے نکل جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے۔ مسجد نبوی میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ آج بھی وہ جگہ محفوظ ہے اس کو اسطوانہ حنانہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب صحابہ کی تعداد بڑھنے لگی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ کوئی بلند جگہ ہو جس پر قیام فرمایا کریں اور وہاں سے خطبہ ارشاد فرمایا کریں۔ اس غرض سے ایک صحابیؓ نے منبر ڈیزائن کیا کہ جس پر آپ بیٹھ بھی سکیں اور اگر کھڑے ہونا چاہیں تو کھڑے بھی ہو سکیں۔ چناں چہ وہ منبر بنا کر لے آئے۔ اب بہ ظاہر اتنا کافی ہے، لیکن یہ تفصیلات کہ یہ منبر کس لکڑی کا تھا، وہ منبر کس نے بنایا تھا، اس کا سائز کیا تھا، اس کا ڈیزائن کیا تھا، وہ لکڑی کس نے کاٹی تھی، کس جنگل سے کاٹ کر لائی گئی تھی، کہاں بیٹھ کر منبر بنایا گیا، اس پر لوگوں نے معلومات جمع کیں اور کتابیں لکھیں، سیرت پر قدیم لٹریچر میں منبر کے ڈیزائن اور اس کے بارے میں لکھی گئی تقریباً بیس کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوتا کیسا استعمال فرماتے تھے، نعل مبارک کی شکل کیسی تھی، وہ چمڑے کا تھا کہ ربڑ کا تھا، کون بناتا تھا، کس سے خریدتے تھے، نعل مبارک ٹوٹ جاتا تھا تو کس سے مرمت کراتے تھے، اس پر کتابیں موجود ہیں اور ایک چھوٹا رسالہ اردو میں بھی دست یاب ہے یہ اس شخصیت کے حالات کا تحفظ ہے جو حامل قرآن اور ناقل قرآن ہے، جس کے ذریعے قرآن ہم تک پہنچا۔

۸۔ وہ علوم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے متعلق ہیں یعنی علوم سیرت، ارشادات اور سنت اور عمل سے متعلق تو سنت اور حدیث ہوگئی لیکن آپ کی ذات سے متعلق، آپ کی شخصی اور جسمانی حالات اور واقعات سے متعلق ان کی وسعتوں کو اگر بیان کیا جائے تو اس کے لئے میری اور آپ کی عمریں کافی نہیں ہیں۔ لوگ تسلسل سے جس طرح سے تحقیق کرتے آرہے ہیں، اس کے نتیجے میں جو نئے نئے معاملات اور مسائل سامنے آرہے ہیں اس کا صرف ایک ہی سبب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے تحفظ کے لئے سنت کا تحفظ فرمایا، سنت کے تحفظ کے لئے صاحب سنت کا تحفظ فرمایا، صاحب سنت کی سیرت کے تحفظ کے لئے ہر وہ چیز جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متعلق تھی محفوظ رکھی گئی۔

۹۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہ راہ راست مخاطبین اور ہمراہیوں یعنی صحابہ کرام کے حالات محفوظ رکھے گئے۔ کم وبیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات محفوظ اور موجود ہیں۔ اور جو صحابیؓ جتنے قریب تھے ان کے حالات اسی قدر تفصیل اور دقت نظر کے ساتھ محفوظ ہیں۔ انسان اپنے دوستوں کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔ یہ ہر قوم میں ایک دلیل اور ایک کلیہ ہے۔ انسانی تاریخ کی بہترین شخصیتیں ہر اعتبار سے وہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہیں جنھوں نے حضور کا ساتھ دیا۔ اس لئے قرآن اور صاحب قرآن کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید پر اجتماعی طور پر عمل درآمد کیسے ہوا؟ سنت کی اجتماعی تشکیل کیسے ہوئی؟ حدیث کی رہ نمائی کی روشنی میں امت نے کیسے جنم لیا؟ یہ چیزیں سمجھ میں نہیں آسکتیں جب تک کہ صحابہ کرام کے حالات محفوظ نہ ہوں۔ صحابہ کرامؓ کا تذکرہ محفوظ ہے اور کم وبیش پندرہ ہزار صحابہ کرامؓ کے حالات نام بہ نام اور نسل بہ نسل دست یاب ہیں۔

۱۰۔ ان صحابہ کرام کے حالات ہم تک کس طرح پہنچے؟ میں نے عرض کیا کہ چھ لاکھ افراد کے بارے میں معلومات محفوظ ہیں۔ چھ لاکھ افراد کے بارے میں یہ واقعات جمع کئے گئے کہ یہ کون لوگ تھے؟ کس زمانے میں پیدا ہوئے؟ ان کی شخصیتیں کس درجے کی تھیں؟ ان کا علم وفضل کس درجے کا تھا؟ اس پر علم رجال کے عنوان سے جب گفت گو ہوگی تو تفصیل سامنے آئے گی، علم رجال ایک ایسا فن ہے جس کی کوئی مثال دنیا کے کسی مذہبی یا غیر مذہبی فن میں نہیں ملتی۔ یہ دس چیزیں ہیں جو سنت اور قرآن پاک کے تحفظ کی خاطر محفوظ رکھی گئیں اور اللہ کی مشیت اس کی متقاضی ہوئی کہ ان سب چیزوں کو محفوظ رکھا جائے۔

پھر محض ان کے محفوظ رکھنے پر اکتفاء نہیں ہوا، بل کہ سنت نے اور احادیث کے ذخیرے نے ایک ایسا اہم کردار ادا کیا جس نے ایک علمی سرگرمی کو ایک تحریک کی شکل دے دی۔ ایک فکری سرگرمی کو جنم دیا، ایک ایسے تعلیمی عمل کا آغاز کیا جو تسلسل کے ساتھ آج بھی جاری ہے۔ حدیث اور سنت کے یہ ذخائر اسلامی علوم وفنون میں نہ صرف مسلسل بقا اور تحفظ کی ضمانت ہیں، بل کہ اس کی مسلسل توسیع اور وسعت بھی علوم حدیث اور علوم سنت کے ذریعے ہو رہی ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ ایک مشہور محدث ہیں اور مالکی فقہا میں ان کا ایک بہت بڑا مقام ہے، مفسر قرآن بھی ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ تمام اسلامی علوم، جن کی تعداد اس وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساڑھے سات سو کے لگ بھگ اندازہ کی جاتی تھی، علوم سنت کی شرح ہیں اور سب کے سب بالواسطہ یا بلا واسطہ حدیث اور سنت کی تفسیر اور توضیح سے عبارت ہیں۔ اور حدیث اور سنت قرآن پاک کی شرح ہے۔ لہذا قرآن پاک، حدیث اور دیگر تمام علوم وفنون میں وہ رشتہ ہے جو درخت میں، اس کے تنے اور شاخوں میں اور پھلوں اور پھولوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ سارے علوم وفنون پھل اور پھول اور پتے ہیں، سنت شاخیں اور تنا ہے اور قرآن پاک وہ جڑ ہے جس سے یہ سارے علوم وفنون نکلے ہیں۔ یہاں تفصیلی مثالیں دینے کا موقع نہیں ہے، چند مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں، جن سے یہ پتہ چلے گا کہ اسلامی علوم وفنون کا آغاز علم حدیث اور سنت کی بنیاد پر کیسے ہوا؟

مسلمانوں کا ایک بہت بڑا اور اہم فن ہے علم کلام ۔ جس کو بعض لوگ انگریزی میں Scholasticism بھی کہتے ہیں اور جس کو آپ Theology بھی کہہ سکتے ہیں۔ علم کلام سے مراد وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل کے ذریعے اسلام کے عقائد کو ثابت کیا جائے اور اسلام کے عقائد پر دوسرے مذاہب اور نظریات کے اعتراض کا جواب دیا جائے۔ اس کو علم کلام کہتے ہیں۔ اس پر صرف چند کتابیں ہی نہیں بل کہ پوری لائبریریاں اور کتب خانے موجود ہیں۔ لیکن اس علم کا آغاز جن مسائل سے ہوا، وہ مسائل سب سے پہلے تفصیل کے ساتھ علم حدیث میں بیان ہوئے۔ جب محدثین نے احادیث کے ان پہلوؤں پر غور شروع کیا جن میں عقائد بیان ہوئے تھے اور جب انہوں نے ان احادیث کی تشریح کرنی چاہی تو ان مباحث کے نتیجے میں علم کلام پیدا ہوا۔

ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ مسلمان ہونے کے لئے ایمان لانا لازمی شرط ہے۔ لیکن ایمان کس کو کہتے ہیں؟ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ کیا محض دل میں یہ خیال ہونا کہ اللہ ایک ہے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ کے رسول ہیں، یہ کافی ہے؟ یا ایمان کے لئے اس سے زیادہ کچھ ہونا چاہئے؟ پھر اس سے زیادہ اگر ہو تو کیا ایمان میں کمی بیشی ہوسکتی ہے؟ ایک رائے اس زمانے میں یہ سامنے آئی کہ ایمان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے وہ محدود متعین ہیں۔ مثال کے طور پر

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَانُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۱۱)

جو کچھ رسول پر اس کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس پر رسول اور مومنین یقین رکھتے ہیں، ہر ایک، اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسولوں پر ایمان لے آیا، ہم ان میں سے کسی ایک رسول میں بھی فرق نہیں کرتے۔

یہ جو ایمان مفصل یا ایمان مجمل ہے، یہ تو متعین ہے۔ اس میں کمی بیشی کا مطلب یہ ہے کہ میں پانچ چیزوں کی بہ جائے چھ چیزوں کا مانتا ہوں۔ یا پانچ کے بہ جائے چار کو مانتا ہوں جو ایمان کی تحدید کے خلاف ہے۔ لہٰذا ایمان میں کمی بیشی تو نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس کچھ حضرات کا خیال تھا کہ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے کہ جب کوئی نئی آیت نازل ہوتی ہے تو زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (۱۲) یعنی ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے تو اگر ایمان بڑھ جاتا ہے تو گھٹ بھی سکتا ہے۔ اس پر محدثین کے ہاں لمبی بحثیں ہوئیں۔ امام بخاریؒ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہے۔ بعض دوسرے اہل علم اور محدثین مثلاً حضرت امام ابوحنیفہ اس رائے کے قائل تھے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ ان دونوں آرا میں کوئی تعارض نہ سمجھئے گا۔ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، ان کی مراد ہے کمیت یعنی Quantity کے اعتبار سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، جو ایمان کا کم سے کم تقاضا ہے کہ اللہ کو اس کے رسول کو، کتابوں کو، روز آخرت کو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو اور آپ کی تعلیم کو مانا جائے، اس میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ اس میں اگر کوئی ایک چیز بھی آپ گرا دیں گے تو آپ مسلمان نہیں رہیں گے۔ اگر کوئی کہے کہ میں باقی چیزوں کو تو مانتا ہوں بس روز آخرت کو نہیں مانتا۔ یا مثلاً باقی تمام انبیاء کو مانتا ہوں ایک موسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ نہیں مانتا۔ اگر کوئی شخص ان میں کسی ایک چیز کو بھی کم کرے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے گا۔ اگر کوئی چیز اپنی طرف سے بڑھا دے کہ میں سب انبیاء کو مانتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ فلاں صاحب کو بھی نبی مانتا ہوں جو بعد میں وارد ہوئے، ایسا کہنے والا بھی مسلمان نہیں رہے گا۔ اس لئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی وہ بالکل صحیح کہتے ہیں، یعنی Quantity اور مقدار کے اعتبار سے ایمان میں کمی یا بیشی نہیں ہو سکتی، البتہ Quality معیار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے وہ کیفیت کے اعتبار سے کہتے ہیں کہ ایمان میں کیفیت اور شدت کے اعتبار سے کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ایمان کی Intensity یعنی شدت کے بہت سے درجات ہو سکتے ہیں۔ ایمان کی شدت میں ہمیشہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرام کو جو ایمان حاصل تھا وہ ہمیں اور آپ کو حاصل نہیں ہے۔ کسی اور کو بھی ایمان کا وہ درجہ حاصل نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوسکتا۔ لیکن اس پورے سلسلہ گفت گو میں ایک بحث اور پیدا ہوئی جس میں ایمان کی نوعیت پر ذرا فلسفیانہ انداز سے غور شروع ہوا۔ زیادہ گہرائی میں جا کر غور ہوا۔ اس سے علم کلام پیدا ہوا۔

یہ بات بڑی بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ جن اہل علم نے سب سے پہلے کلامی اور فلسفیانہ نوعیت کے یہ سوالات اٹھائے وہ اصلاً محدثین تھے۔ مثال کے طور پر امام بخاریؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے محدثین نے ان سوالات سے بحث کی کہ کلام الٰہی قدیم ہے کہ حادث ہے، یہ خالص عقلی اور فلسفیانہ مسئلہ ہے۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ نے یہ مسئلہ اٹھایا جو ایک محدث ہیں۔ ان مثالوں سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علم حدیث نے اور ذخیرہ حدیث نے ایک نیا رجحان مسلمانوں کے علوم وفنون میں پیدا کیا۔ اور اسلامی عقائد کی تعبیر، اسلامی عقائد پر اعتراضات کا عقلی انداز سے دفاع کرنے کی کوششیں ایک نئے علم کی تشکیل پر منتج ہوئیں جس کو علم کلام کہتے ہیں۔ جس میں مسلمانوں نے بڑے غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

اس وقت علم کلام کی تاریخ میں جانا مقصود نہیں۔ لیکن متکلمین اسلام نے مسلمانوں کو اس گم راہی سے محفوظ رکھا جس کا بڑے بڑے لوگ شکار ہوئے اور بڑے بڑے مذاہب اس گم راہی میں مبتلا ہوئے۔ ہر مذہب میں ایک چیلنج یہ درپیش رہا کہ معاملات میں اصل چیز انسانی عقل ہے یا وحی الٰہی ہے؟ مذہب اصل ہے یا عقل، بالفاظ دیگر انسان کے لئے ضابطۂ زندگی کی تشکیل میں وحی الٰہی فیصلہ کن ہے یا عقل کو فیصلہ کرنے کا حتمی اختیار حاصل ہے؟ کچھ لوگوں نے کہا کہ عقل ہی معاملات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا کہنے سے مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جیسے مغرب میں ہوا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اصل فیصلہ کن عامل مذہب ہے۔ اس سے مذہب کو تو کچھ زندگی مل گئی، لیکن عقلیات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور بالآخر مذہب بھی ختم ہو گیا۔ جیسے ہندومت ختم ہو گیا یا دیگر پرانے مذاہب ختم ہو گئے۔ متکلمین نے دونوں کو ایک ساتھ جوڑا۔ متکلمین نے عقل کے رشتے کو خالص دینی معاملات سے برقرار رکھا، دونوں کے تقاضے نبھائے۔ اور دینی معاملات کی عقلی تعبیریں کر کے ان دونوں میں وہ توازن پیدا کیا کہ مسلمانوں میں بہ یک وقت عقلی سلسلے بھی جاری رہے اور نقل کی بنیاد پر جو سلسلے تھے، وہ بھی جاری رہے۔ اور ان دونوں میں کوئی تعارض پیدا نہیں ہوا۔ یہ نیا علم یعنی علم کلام علم حدیث کی دین ہے۔

فقہ مسلمانوں کے عملی رویے کی تشکیل کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں کی عملی زندگی انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسی ہونی چاہئے۔ روزمرہ کے معاملات کو شریعت کے مطابق کیسے ڈھالا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک مثالی اور متوازن اسلامی زندگی کیسے ہوتی ہے؟ فقہ اور حدیث کو دو الگ الگ چیزیں مت سمجھئے گا۔ یہ بڑی کم علمی کی بات ہے۔ فقہ سے مراد یہ ہے کہ قرآن وسنت کی ان نصوص کو جو انسانوں کے عملی رویے کی تشکیل سے عبارت ہیں گہرائی کے ساتھ سمجھا جائے۔ اور ان میں جو ہدایت اور رہ نمائی دی گئی ہے اس کو مختلف صورت ہائے احوال پر منطبق کیا جائے۔ اس عمل کا نام فقہ ہے اور اس کے نتیجے میں جو ہدایات مرتب ہوئیں ان سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا۔ لیکن اس فن کی بنیاد علم حدیث پر ہے۔ اور علم حدیث سے ہی یہ چیزیں سامنے آئیں۔

احادیث میں نماز کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ حج کے احکام بیان ہوئے ہیں، مناسک کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ خرید وفروخت کے احکام، نکاح وطلاق کے احکام اور وراثت ووصیت کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ یہ سارے احکام وہ ہیں جن سے وہ بنیادیں تشکیل پاتی ہیں جن کی عملی تفصیلات فقہائے اسلام اور محدثین کرام نے مرتب فرمائیں۔ اگر علم حدیث نہ ہوتا تو علم فقہ وجود میں نہ آتا

جو ابتدائی فقہا ہیں اور جن سے فقہ وجود میں آئی ہے وہ سب کے سب اصلاً محدثین تھے۔ امام مالکؒ اصل میں محدث تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ اصلاً محدث تھے۔ امام شافعیؒ اصلاً محدث تھے۔ امام محمد بن حسن شیبانی اور امام ابو یوسفؒ اصلاً محدث تھے۔ امام اوزاعی محدث تھے۔ امام ابو جعفر طبری محدث تھے، امام سفیان ثوری اور سفیان بن عیینہ محدث تھے۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جن سے فقہی مسالک وجود میں آئے۔ اس لئے کہ انہوں نے احادیث پر اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ اس سے کون سے احکام نکلتے ہیں؟ جن محدثین نے اس نقطہ نظر سے احادیث پر غور کیا کہ ان سے عقائد کون سے نکلتے ہیں۔ یعنی حسن بصری اور اس طرح کے اور بزرگ، ان کے غور وفکر کے عمل سے علم کلام مرتب ہوا، اور جن بزرگوں نے اس نقطہ نظر سے غور کیا کہ احادیث سے احکام کون سے نکلتے ہیں۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں فقہ مرتب ہوا۔

اصول فقہ یعنی وہ بنیادی اصول اور وہ بنیادی رہ نمائی جس سے کام لے کر روزمرہ کے فقہی احکام معلوم کئے جاسکتے ہیں یہ سارے کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ علم حدیث اور سنت میں وہ احکام بیان ہوئے ہیں جن سے اصول فقہ کا علم نکلا ہے۔ مسلمانوں کی عبقریت کے دو عظیم الشان نمونے ہیں۔ ایک علم حدیث اور دوسرا علم اصول فقہ۔ علم حدیث اس نبوغ اور عبقریت کا نمونہ ہے کہ جس میں معلومات اور معاملات کی وسعت [illegible] اور اصول فقہ اس نبوغ اور عبقریت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا نمونہ ہے جس میں تخلیقی صلاحیتیں اور نئے نئے افکار ونظریات کو سامنے لانے پر معاملات کی بنیاد ہو۔ علم اصول فقہ نے علم کلام سے کہیں زیادہ عقل ونقل کے درمیان تطبیق پیدا کی ہے اور عقل اور نقل کے درمیان توازن پیدا کیا ہے۔ اس توازن واعتدال اور جامعیت کی مثال دنیا کی کسی قوم کے مذہب یا علمی روایت میں نہیں ملتی۔ اور یہ بات آپ بلاخوف تردید نوٹ کرلیں کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ آج ایسا علم ہے، نہ ماضی میں تھا اور نہ ماضی بعید میں کوئی ایسا علم تھا، جس کو اصول فقہ کے مقابلے میں رکھا جاسکے، جو بہ یک وقت خالص دینی علم بھی ہو، اس اعتبار سے اس کی اساس قرآن پاک اور سنت رسول پر ہو، اور بہ یک وقت اس کی بنیاد خالص عقلی اور تجرباتی معاملات پر بھی ہو، جس کو عقل کا بڑے سے بڑا پرستار بھی عقلی بنیادوں پر غلط قرار نہ دے سکے۔ یہ مستحکم بنیادیں اصول فقہ کو علم حدیث سے حاصل ہوئیں۔

دنیا میں اسلام سے پہلے بھی تاریخ کا تصور موجود تھا۔ اسلام سے پہلے تاریخ کی بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں جن میں قوموں کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ یونانیوں میں بھی موجود تھیں ہندوستانیوں میں بھی موجود تھیں اور رومیوں میں بھی موجود تھیں۔ ہیروڈوٹس اسلام سے پہلے کا مورخ ہے۔ اس کی بیان کی ہوئی معلومات آج بھی دست یاب ہیں۔ وہ کتنا مستند ہے یہ ایک دوسری بات ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے کی تاریخ اور تمدنی معلومات کا ایک ذخیرہ بہر حال موجود ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسلام سے پہلے کی کتابیں موجود ہیں جن میں کچھ تاریخی نوعیت کی معلومات بھی شامل ہیں۔ لیکن وہ چیز جس کو اسلام سے پہلے تاریخ کہا جاتا تھا، وہ کیا تھی؟ آج دنیا کا کوئی مورخ اسلام کے اس احسان کو مانتا ہے یا نہیں مانتا۔ مانتا ہے تو بلاشبہ عدل و انصاف کی بات کرتا ہے اور نہیں مانتا تو بڑا احسان فراموش یا کم از کم ناواقف ضرور ہے۔ لیکن تاریخ کا صحیح تصور اور تاریخ کا وہ صحیح شعور جس طریقے سے مسلمانوں کو اور ان سے دنیا کو حاصل ہوا اس کا اولین مصدر وماخذ علم حدیث ہے۔

اسلام سے پہلے تاریخ کا جو تصور تھا وہ یہ تھا کہ کسی قوم میں جو قصے کہانیاں مشہور ہیں ان کو مدون کرلیا جائے، جو رطب ویابس دست یاب ہے اس کو حقیقت مان لی جائے۔ گویا جب تاریخ لکھنے بیٹھو تو عوام میں رائج قصے جمع کرلو، وہ سارے کے سارے بیان کردو، اور نقل کر کے جمع کردو۔ کوئی یہ پوچھنے والا نہیں تھا کہ ہیروڈوٹس صاحب! آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماخذ کیا ہے؟ یہ چیز آپ نے صحیح لکھی ہے کہ غلط لکھی ہے؟ کس سے پوچھ کر، کس سے سن کر یا کن ماخذ کی مدد سے لکھی تھی؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ سے کس نے بیان کیا؟ آپ وہاں موقع پر موجود تھے کہ نہیں تھے؟ آپ اس کے چشم دید گواہ تھے کہ نہیں تھے؟ اس وقت نہ یہ سوالات تھے اور نہ ایسا کوئی تصور تاریخ کے بارے میں موجود تھا۔

علم حدیث نے سب سے پہلے لوگوں کو یہ تصور دیا کہ جب کوئی واقعہ بیان کرو تو پہلے خود یہ اطمنان کرو اور پھر دوسروں کو یہ اطمنان دلاؤ کہ تم اس واقعے کے عینی شاہد ہو۔ اگر عینی شاہد نہیں ہو تو جو عینی شاہد تھا اس کا حوالہ دو کہ مجھ سے فلاں شخص نے بیان کیا جو عینی شاہد تھا۔ پھر اس بات کا یقین دلاؤ کہ تم جس واقعے کو بیان کر رہے ہو اس کو بیان کرنے میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے؟ اگر اس میں تمہارا کوئی ذاتی مفاد ہے تو ہم تمہارے بیان کو قبول کرنے میں تامل کریں گے۔ اس لئے کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر آدمی بہت سی باتوں کو غلط طور پر نمایاں کر سکتا ہے اور صحیح باتوں کو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دبا سکتا ہے۔

یہ تصورات سب سے پہلے مسلمانوں نے دیئے، سب سے پہلے اسلامی علوم وفنون میں یہ اصول پیدا ہوئے اور مسلمان مورخین نے ان کو مسلمانوں کی تاریخ پر منطبق کر کے دکھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کر دی اور تاریخ نویسی کے اصول مقرر کر دیئے۔ یہ دنیا کو علم حدیث کی ایک ایسی بڑی دین ہے جس کے احسان سے دنیا کبھی بری الذمہ نہیں ہو سکتی۔ گزشتہ تین چار سو سالوں کے دوران مغرب میں بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے، جو فلسفہ تاریخ کے مورخین مانے جاتے ہیں، جن کی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ لیکن آج ان مورخین کو جو اعتبار حاصل ہوا ہے اس کی بنیاد کیا ہے؟ یہ اصول تاریخ ان حضرات کے ہاں کہاں سے آئے؟ مسلمانوں میں سب سے پہلے مورخین ابن خلدون اور علامہ سخاوی ہیں جنہوں نے اصول تاریخ نویسی اور فلسفہ تاریخ کو نئے انداز سے مرتب کیا۔ علامہ سخاوی اصلاً علم حدیث کے امام تھے ان کی تصنیف الاعلام بالتوبیخ لمن ذم اہل التاریخ ہے، جو فلسفہ تاریخ اسلامی کی ایک بڑی نمایاں کتاب ہے، اس میں انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ نویسی کے اصول بیان کئے ہیں جو تمام کے تمام علم حدیث سے ماخوذ ہیں۔

اصول دعوت اور اسلوب دعوت ایک اہم موضوع ہے۔ مسلمان اہل علم نے اس پر بیسویں صدی میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ یعنی یہ مباحث کہ دعوت کا اصول کیا ہے؟ جب دوسروں کو دعوت دی جائے تو کیسے دی جائے؟ دوسروں تک اسلام کا پیغام پہنچایا جائے تو کیسے پہنچایا جائے؟ بعد میں یہ پوری امت مسلمہ کا ایک انفرادی رویہ اور ایک طرز عمل بن گیا کہ وہ ہر جگہ اسلام کو لے کر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے۔ ان ہیں کار دعوت کے اصول اور اس باب میں جو رہ نمائی ملی وہ احادیث سے ملی

تزکیہ واحسان یعنی انسان کو اندر سے کیسے پاکیزہ کیا جائے؟ انسان کے اخلاق کو اندر سے کیسے سدھارا جائے؟ یہ مسلمانوں میں ایک بہت بڑا فن ہے۔ اس پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ بعض کتابیں اچھی ہیں، بعض اچھی نہیں ہیں۔ بعض کتابوں میں ایسا مواد بھی ہے جو اسلامی نقطہ نظر سے نظر ثانی کا محتاج ہے۔ لیکن بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن میں بڑی صحیح باتیں کہی گئی ہیں اور احادیث اور سنت کی تعبیر اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی مزاج اور اندر کی اصلاح کیسے ہوتی ہے۔ اخلاق و کردار سازی کیسے ہوتی ہے؟ اس کو علم تزکیہ اور احسان کہتے ہیں۔ یہ سارے کا سارا علم حدیث سے عبارت ہے۔ اور اس کی بنیاد ان احادیث پر ہے جن کو رقاق کہتے ہیں، یعنی اندر سے دل کو کیسے نرم کیا جائے۔ ان احادیث میں جو رہ نمائی ملتی ہے اس کو علمی انداز سے کیسے مرتب کیا جائے۔ اس سے ایک نیا فن پیدا ہوا۔

علم سیر یعنی اسلام کا بین الاقوامی قانون، یہ سارا کا سارا علم حدیث کی دین ہے۔ شروع میں علم حدیث کے وہ علماء اور محدثین جن کو بین الاقوامی تعلقات اور قانون صلح و جنگ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ احادیث کے ان حصوں کو زیادہ محفوظ رکھتے تھے اور ان احادیث کو زیادہ پڑھتے اور پڑھاتے تھے جن سے بین الاقوامی قانون پر روشنی پڑتی ہو۔ اس طرح مغازی اور غزوات رسولؐ پر الگ سے کتابیں وجود میں آنی شروع ہوئیں تو علم مغازی وجود میں آیا، علم غزوات میں جو احکام ہیں وہ وجود میں آئے تو قانون جنگ وجود میں آنا شروع ہو گیا اور دوسری صدی ہجری شروع ہونے سے پہلے پہلے بین الاقوامی قانون کے موضوع پر سیر کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آ گیا جس کو علم سیر کہتے ہیں جس کی بنیا اصلاً احادیث رسول پر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا تھا اور بجا فرمایا تھا:

انا افصح العرب (۱۳)

میں عرب میں سب سے فصیح انسان ہوں۔

اللہ نے دنیا کی سب سے فصیح و بلیغ قوم کو قرآن کے تحمل کے لئے منتخب فرمایا۔ اور جو رسول بھیجا، اسے ایسے شہر میں بھیجا جو فصاحت و بلاغت میں اپنی جگہ معیار سمجھا جاتا تھا۔ جہاں کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، یعنی مکہ مکرمہ میں، اس قبیلے میں بھیجا جس کی زبان بڑی ٹکسالی سمجھی جاتی تھی یعنی قریش۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات ماخذ ہیں فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا۔ جن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مفسرین اور محدثین نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ سنت اور حدیث کے ذخائر کا فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا۔ ان کی کاوشوں کے نتیجے میں علم بلاغت کے قواعد مرتب ہونے شروع ہوئے۔ اور یوں بلاغت کے نام سے ایک نیا فن وجود میں آنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ایک بڑا فن معرض وجود میں آ گیا۔

یہ وہ علوم وفنون ہیں جو بہ راہ راست علم حدیث کی تاثیر کے نتیجے میں مسلمانوں کے ہاں وجود میں آئے۔ لیکن علم حدیث کی اہمیت ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہر آنے والا دن علم حدیث میں ایک نیا میدان ہمارے سامنے لے کر آتا ہے۔ ہر نیا آنے والا استاد علم حدیث کا نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے اور نیا آنے والا ہر طالب علم نئے انداز سے مطالعہ کرتا ہے۔ علم حدیث کے نئے نئے گوشے روز بروز ہمارے سامنے آتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن علم حدیث کی جو دیرپا اہمیت ہے جو دائمی، ازلی اور ابدی اہمیت ہے، وہ ہے بہ طور ماخذ تشریع اور ماخذ قانون کے۔

قرآن وسنت کا باہمی تعلق

ماخذ قانون اور ماخذ شریعت ہونے کی حیثیت سے قرآن اور سنت دونوں میں اتنا گہرا باہمی تعلق ہے کہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ قرآن مجید بنیاد ہے، سنت رسول اس بنیاد پر تعمیر کیا جانے والا ڈھانچہ ہے۔ قرآن مجید تنا ہے اور سنت رسول اس تنے سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ قرآن مجید ایک ایسا مرکز نور ہے جس سے شعاعیں نکل رہی ہیں اور وہ شعاعیں سنت رسول ہیں۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول اور کلیات بیان کئے گئے ہیں۔ فقہی احکام کے اصول وکلیات جہاں جہاں بیان ہوئے ہیں جزئیات کے پردے میں بیان ہوئے ہیں۔ ان کلیات کی عملی تطبیق احادیث کے ذریعے ہوئی۔ اس عملی تطبیق کے نتیجے میں مزید احکام نکلے، فقہائے اسلام نے ان پر غور کیا۔ غور کرنے سے مزید احکام نکلتے چلے گئے۔ جب دو قسم کے احکام کو سامنے رکھا گیا تو تیسری قسم کے احکام سامنے آ گئے، تیسرے اور دوسرے حکم کو سامنے رکھا تو چوتھا حکم سامنے آیا، چوتھے اور تیسرے کو سامنے رکھا تو پانچواں حکم سامنے آ گیا۔ یہ سلسلہ آج تک چلتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر مرحلے پر ان میں سے ہر حکم کی بہ راہ راست وابستگی احادیث رسول اور سنت رسول سے ہے۔ کوئی حکم اور کوئی فقہی مسلک اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک اس کو بہ راہ راست حدیث رسول سے نسبت حاصل نہ ہو۔ گویا احدیث رسول نے فقہی ارتقا اور قوانین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی توسیع کے عمل کو اس طرح سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے جس طرح گھوڑے کی لگام سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسانی تصورات کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ انسان کا ذہن ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ انسان کا ذہن کسی افق کا پابند نہیں ہوتا۔ آپ رات کو آنکھیں بند کر کے لیٹیں اور سوچیں تو لگے گا کہ پوری کائنات کا افق آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ اس افق میں نہ زمین ہے نہ آسمان ہے۔ اس کی نہ حدود وثغور ہیں، نہ کوئی ابتدا نہ انتہا، نہ کچھ اور ہے۔ یہ ایک لامتناہی وسعت ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہی وسعت انسان کی عقل میں ہوتی ہے۔ اگر اس لامتناہی وسعت کو کسی حد اور ضابطے کا پابند نہ کیا جائے تو انسان کبھی مشرق کی طرف جائے گا کبھی مغرب کی طرف جائے گا اور اس کے سامنے کوئی راستہ متعین نہیں ہوگا۔ بار بار ایک ہی سفر کو طے کرے گا۔ اس لئے اس کی لگام کو کس کے رکھنا ضروری ہے۔ اس کو حدود کا پابند کر کے رکھنا ضروری ہے۔ یہ حدود کی پابندی اور یہ لگام کسنے کا عمل حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔

قرآن مجید کے عمومی کلیات یا ہدایات وہ ہیں کہ اگر حدیث وسنت کا حوالہ ختم کر دیا جائے تو ان کی اچھی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور بری تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں خود ایک جگہ لکھا ہوا ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا (۱۴)

کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گم راہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔

جو لوگ سنت اور حدیث سے سے ہٹ کر قرآن سے رہ نمائی لینا چاہتے ہیں وہ گم راہ ہو جاتے ہیں اس لئے کہ قرآن مجید کی تعلیم ایک عمومی چیز ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں عدل کی تعلیم ہے۔ لیکن عدل سے کیا مراد ہے؟ عدل کیا چیز ہے؟ جب تک اس کو سنت کی روشنی میں نہیں دیکھا جائے گا، اس وقت تک آپ کا جو جی چاہے عدل کو معنی پہنا دیں۔

آج سے تقریباً ستر اسی سال پہلے برصغیر میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنہوں نے کہا کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے حدیث اور سنت کی ضرورت نہیں ہے، چوں کہ حدیث اور سنت میں بڑا اختلاف ہے اس لئے اس نے مسلمانوں میں فرقے پیدا کئے ہیں۔ ایک بزرگ ان صاحب سے ملے اور ان سے کہا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سنت اور حدیث کی وجہ سے اختلاف پیدا ہوا ہے تو قرآن کی بنیاد پر اتحاد ہو جائے گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن آپ ذرا یہ بتایئے کہ قرآن پاک میں نماز کا حکم ہے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نماز آپ کیسے پڑھیں گے؟ اب تک تو ایک متفق علیہ شکل یہ رائج تھی کہ حدیث میں نماز پڑھنے کا جو طریقہ ہے اس طرح پڑھیں ۔لیکن یہ شکل آپ کے لئے قابل قبول نہیں اور اس کو آپ ختم کرنا چاہتے ہیں تو پھر نماز آپ کے طریقے سے پڑھی جائے یا ہر شخص اپنے دل پسند طریقے سے پڑھے؟ پہلے تو انہوں نے کہا کہ نہیں میں بتاؤں گا اقیموا الصلوٰۃ کا کیا مطلب ہے اور نماز کیسے پڑھی جائے ۔اس پر ان بزرگ نے ان منکر حدیث صاحب سے کہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتانے کا حق نہیں کہ نماز کیا ہے اور کیسے پڑھی جائے اور ان کے بتانے سے اختلاف ہوتا ہے تو پھر خود آپ کو کیا حق پہنچتا ہے؟ اور آپ کے بتانے سے اختلاف کیوں نہیں بڑھے گا؟ تھوڑی ردّ وقدح کے بعد ہی انہوں نے اپنا مؤقف بدلا اور کہنے لگے کہ نہیں ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق پڑھے گا ۔اس پر ان بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت تو مسلمانوں میں نماز پڑھنے کے تین یا چار طریقے ہوں گے ،کوئی ناف کے اوپر ہاتھ باندھتا ہے کوئی نیچے باندھتا ہے،لیکن اس وقت تو ایک ارب طریقے ہوں گے ۔کیوں کہ ہر شخص اپنے طریقے سے پڑھے گا۔تو جو چیز وحدت کا سبب بنی اس کو وحدت ہی کی خاطر آپ ختم کرنا چاہتے ہیں اس سے تو اتنا اختلاف پیدا ہو جائے گا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی ۔کہنا یہ ہے کہ قرآن مجید کی جو عمومی ہدایات اور احکام ہیں ان کی عملی تشکیل ،اور یقینی تشکیل اور متفقہ اور متحدہ تشکیل اگر ہوتی ہے تو صرف اور صرف حدیث اور سنت کے ذریعے ہوتی ہے۔ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتی۔

دشمنان اسلام کی اور گمراہ فرقوں کی ہمیشہ یہ کاوش رہی ہے کہ حدیث اور سنت کا اور قرآن مجید کا تعلق منقطع کر دیا جائے ۔حضرت علی بن طالبؓ کے زمانے میں خوارج کے نام سے ایک فرقہ پیدا ہوا۔جن میں اکثر و بیشتر بڑے کم علم لوگ تھے، وہ عموماً بدو قسم کے لوگ تھے، زیادہ علم نہیں تھا۔ قرآن پاک تھوڑا بہت جانتے تھے ۔حدیث کے ذخائر سے واقف نہیں تھے ۔انہوں نے بعض معاملات میں حضرت علیؓ کے فیصلوں پر اعتراضات کئے اور ان کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ حضرت علیؓ نے خوارج سے گفت گو کرنے کے لئے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو بھیجا، جو صحابہ کرام میں علم وفضل کے لحاظ سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے، اور قرآن فہمی میں ترجمان القرآن کا لقب ان کو حاصل تھا، اور ان ہیں یہ تاکید کی کہ خوارج تم سے قرآن پاک کے حوالے سے بات کریں گے تو تم قرآن پاک کے حوالے سے بات مت کرنا۔اس لئے کہ قرآن پاک کے حکم میں تو متعدد تعبیریں ہوسکتی ہیں لیکن جو صحیح تعبیر ہے وہ صرف حدیث اور سنت ہی سے ملے گی، اس لئے سنت کے حوالے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے ان سے بات کرنا۔ یہ ایک جلیل القدر صحابیؓ دوسرے جلیل القدر صحابیؓ کو مشورہ دے رہا ہے۔ چناں چہ حضرت ابن عباسؓ نے جا کر خوارج سے سنت ہی کے حوالے سے بات کی اور بہت سے خوارج کو ان کی گم راہیوں سے روکا اور نکالا۔ اس لئے علم حدیث کی اہمیت مسلمانوں کے لئے نہ صرف علوم وفنون کی خاطر بل کہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بھی ناگزیر ہے۔

علم حدیث کے آٹھ موضوعات مشہور ہیں، وہ کتابیں جو علم حدیث کے ان سارے موضوعات پر حاوی ہوں جامع کہلاتی ہیں، جیسے امام ترمذیؒ کی کتاب جامع ترمذی کہلاتی ہے، یا صحیح بخاری الجامع الصحیح کہلاتی ہے لیکن کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن میں فقہی احادیث کو فقہی مسائل کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً پہلے وضو کے احکام ہیں پھر نماز کے احکام ہیں، پھر زکوٰۃ کے احکام ہیں، پھر روزے کے احکام ہیں۔ اور صرف فقہی معاملات سے متعلق احادیث کو لیا گیا ہے، وہ کتابیں سنن کہلاتی ہیں۔ جیسے سنن ابوداؤد۔ سنن ابوداؤد کتب حدیث میں فقہی احکام کا ایک بہت بڑا مصدر و ماخذ ہے۔

شروع میں جب احادیث مرتب ہو رہی تھیں اور صحابہ کرامؓ احادیث کا سب سے بڑا ذخیرہ اور مصدر و ماخذ تھے تو ہر تابعی کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ صحابہ کرام کے پاس حاضر ہو کر ان کی احدیث اپنے پاس نوٹ کرلے۔ اس لئے تابعین کے پاس احادیث کے جو مجموعے ہوتے تھے وہ صحابہ سے سنے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً ایک صحابیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سنی ہوئی احادیث اپنے پاس نقل کرلیں۔ پھر حضرت عمرؓ سے سنی ہوئی احادیث نقل کرلیں۔ اس طرح شروع شروع میں جو مجموعے مرتب ہوئے وہ صحابہ کرام کی مرویات کے مجموعے تھے۔ لہٰذا جن کتابوں میں احادیث صحابہ کرام کی ترتیب سے جمع کی گئی ہوں ان کو مسند کہا جاتا ہے۔ مسندوں میں سب سے بڑی کتاب مسند امام احمد ہے جس میں بہت بڑی تعداد میں احادیث شامل ہیں۔ مسند امام احمدؒ کے ساتھ کچھ اور مسندیں بھی ہیں، مسند ابوعوانہ ہے، مسند ابوداؤد طیالیسی ہے۔ یہ سب وہ ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب سے الگ الگ احادیث جمع کی گئی ہیں۔ صحابہ کی ترتیب میں کیا اصول رکھا جائے اس باب میں بھی محدثین کے اپنے اپنے ذوق تھے۔ مثلاً امام احمد نے یہ ترتیب اس حساب سے رکھی ہے کہ اسلام میں ان صحابی کا درجہ کیا ہے؟ چناں چہ سب سے پہلے عشرہ مبشرہ کی احادیث درج کی ہیں۔ عشرہ مبشرہ میں سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی احادیث ہیں۔ پھر بقیہ عشرہ مبشرہ، اس کے بعد ترتیب کے ساتھ وہ دیگر صحابہ جو ان کے خیال میں اسلام میں اونچا مقام رکھتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ مسندوں کے مصنفین نے فیصلہ کیا کہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب رکھیں گے۔ کچھ نے طے کیا کہ رشتہ داری کے حساب سے ترتیب رکھیں گے کہ جس صحابیؓ کی قرابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہوگی، اس کی احادیث پہلے ہوں گی۔ اس لحاظ سے بنی ہاشم کی احادیث پہلے ہوں گی۔ لہٰذا مسند اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں احادیث کو صحابہ کی ترتیب سے بیان کیا گیا ہو۔

حدیث کی ایک کتاب ہوتی ہے 'معجم' آپ نے سنا ہوگا معجم طبرانی کبیر، معجم طبرانی صغیر، معجم طبرانی اوسط، اور بھی کئی معجمیں ہیں۔ معجم سے مراد وہ احادیث ہیں جن میں مرتب کرنے والے محدث نے اپنے استاد کی ترتیب سے احادیث کو جمع کیا ہو۔ مثلاً آپ حدیث کے طالب علم ہیں، آپ نے دس اساتذہ سے احادیث پڑھیں اور ان کی حدیثیں آپ کے پاس ہیں۔ اب جب آپ ان کو کتابی شکل میں مرتب کریں گے تو آپ سب اساتذہ کی احادیث الگ الگ کر دیں گے، باب اول استاد الف کی احادیث ہیں، باب دوم استاد ب کی احادیث ہیں۔ باب سوم استاد ج کی احادیث ہیں۔ اس طرح کی ترتیب پر مشتمل احادیث کی کتاب کو معجم کہتے ہیں۔ اس میں بھی حروف تہجی کی ترتیب ہو سکتی ہے یا کوئی بھی ترتیب ہو سکتی ہے۔ معجم کے نام سے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں طبرانی کی تین معجمیں زیادہ مشہور ہیں۔ پہلے امام طبرانی نے معجم کبیر لکھی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت بڑی ہے اس لئے اس کی تلخیص کی اور معجم صغیر لکھی، پھر خیال ہوا کہ یہ تو بہت چھوٹی رہ گئی تو ایک معجم اوسط لکھی جو درمیانے درجے کی ہے۔ یہ تینوں معجمیں چھپی ہوئی موجود ہیں اور دست یاب ہیں۔

کچھ کتابیں ایسی ہیں کہ جن کے مصنفین نے یہ چاہا کہ صرف ان احادیث کو یکجا کریں جو تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہوں۔ اور جن میں روایت کے اعتبار سے کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ اس طرح کی صحیح احادیث کو انہوں نے کتابی شکل میں مرتب کیا اس کا نام صحیح رکھا گیا۔ امام بخاری کی کتاب کا نام صحیح ہے، صحیح مسلم صحیح کہلاتی ہے، صحیح ابن حبان صحیح کہلاتی ہے، صحیح ابن خزیمہ صحیح کہلاتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو صحیح کے نام سے مشہور ہیں۔ امام بخاری کی کتاب الجامع بھی ہے اس میں آٹھوں ابواب ہیں۔ یہ صحیح بھی ہے کیوں کہ انہوں نے ساری احادیث صحیح بیان کی ہیں اور اس میں غیر صحیح احادیث کو بیان نہیں کیا ہے۔ صحیح سے مراد یہ نہ سمجھئے گا کہ اس کا متضاد غلط ہے اور جو صحیح ہے وہ صحیح ہے باقی غلط ہیں۔ نہیں غلط یہاں مراد نہیں ہے۔ صحیح ایک اصطلاح ہے جس کا ایک خاص مفہوم ہے۔ جو صحیح نہیں ہے وہ لازماً غلط نہیں ہے، غلط بھی ہو سکتا ہے، غیر غلط بھی ہو سکتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ احادیث کی کتابیں ایسی ہیں جن کو مستدرک کہا جاتا ہے۔ مُستدرَک سے مراد وہ حدیثیں ہیں کہ جن میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ محدث کی شرائط کو سامنے رکھ کر احادیث کا جائزہ لیا ہو اور ایسی احادیث میں جو سابقہ محدث سے رہ گئی ہوں ان کو ایک کتابی شکل میں مرتب کر دیا ہو۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی الصحیح ہے، امام مسلم کی الصحیح ہے، ان دونوں حضرات نے یہ طے کیا کہ ہم اپنی کتاب میں صرف وہ احادیث جمع کریں گے جن کی پوری سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک بہ راہ راست پہنچتی ہو، جس کے درمیان میں کوئی خلا نہ ہو، جتنے راوی ہوں وہ سارے کے سارے اپنے حافظے، عدالت اور اخلاقی پیمانے کے معیار پر سو فیصد پورے اترتے ہوں۔ ہم اس میں کوئی ایسی حدیث بیان نہیں کریں گے جو مشہور احادیث اور سنت متواترہ سے متعارض ہو۔ اس طرح کی کچھ اور شرائط انہوں نے اپنے پیش نظر رکھیں۔ امام بخاری کی شرائط میں ایک اضافہ یہ بھی تھا کہ صرف اس راوی کی حدیث لیں گے جس کی اپنے استاد سے ملاقات باقاعدہ ثابت ہو۔ ثبوتِ لقا یعنی ملاقات کے ثبوت کی شرط رکھی۔ امام مسلم نے لکھا کہ ثبوت لقا ضروری نہیں ہے امکان لقا کافی ہے۔ یعنی اگر ایک محدث کسی ایسے محدث سے حدیث بیان کر رہے ہیں جو اس زمانے میں موجود تھے اور ان کے معاصر تھے اور اسی جگہ تھے اور اس کا امکان موجود ہے کہ ان کی آپس میں ملاقات ہوئی ہو، لیکن ان کی یہ ملاقات ہمارے علم میں نہیں آئی، تو میں ان کی حدیث کو تسلیم کر لوں گا کہ وہ صحیح حدیث ہے۔ اس لئے کہ وہ خود اخلاق و کردار کے اتنے اونچے معیار پر ہیں کہ ان کی روایت کو قبول نہ کرنا نامناسب ہے۔

مثلاً امام مالکؒ روایت کرتے ہیں امام زہری سے۔ امام مالکؒ اتنے اونچے درجے کے انسان ہیں کہ مجھے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ امام مالکؒ کی امام زہری سے ملاقات ہوئی تھی کہ نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ روایت کرتے ہیں تو دونوں ایک زمانے میں تھے۔ امام زہری مدینہ منورہ بارہا تشریف لائے، حج کے لئے تشریف لائے، مدینہ منورہ میں ایک عرصہ رہے، اس لئے اس کی تحقیق کئے بغیر کہ ان کی ملاقات واقعی ہوئی بھی تھی کہ نہیں ہوئی تھی میں ان کی روایت قبول کروں گا۔ اس لئے امام مسلم نے کہا کہ امکان لقا کافی ہے ثبوت لقا ضروری نہیں ہے۔ امام مسلم اور امام بخاری کی شرائط اور معیارات میں یہ تھوڑا سا فرق ہے۔ ان معیارات کی بنیاد پر دونوں نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کئے۔ ان دونوں حضرات کے قریبا سو یا سوا سو سال بعد امام حاکم تشریف لائے۔ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مختلف کتابوں میں بہت سی ایسی احادیث موجود ہیں جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان دونوں محدثین کی شرائط پر پوری اترتی ہیں لیکن ان دونوں نے اپنی صحیح میں ان کا ذکر نہیں کیا۔ تو انہوں نے ان احادیث کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو مستدرک کہلاتا ہے۔ لہٰذا مستدرک سے مراد وہ مجموعہ ہے جو کسی سابقہ محدث کی شرائط پر پوری اترنے والی احادیث کا بعد آنے والے محدث نے مرتب کیا ہو۔ جس کی شرائط پر ہوگی اس کی مستدرک کہلائے گی۔ صحیحین کی مستدرک، ابوداؤد کی مستدرک، ترمذی کی مستدرک، اس طرح مستدرک کے نام سے خاصی کتابیں موجود ہیں۔

ایک کتاب کہلاتی ہے 'مُستَخرَج'۔ اس کے لفظ معنیٰ تو ہیں 'نکالی ہوئی'، لیکن 'مُستَخرَج' سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں بعد میں آنے والے کسی محدث نے کسی سابقہ مجموعے کی احادیث دوسری سند سے بیان کی ہوں۔ مثلاً موطا امام مالکؒ ہے۔ اس میں امام مالکؒ ایک حدیث بیان کرتے ہیں کہ 'حدثنا نافع عن ابن عمرؓ عن النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام' کہ میں نے امام نافع سے سنا، انہوں نے ابن عمر سے سنا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور پھر حضور نے یہ بیان فرمایا۔ اب بعد میں آنے والا کوئی محدث یہی روایت کسی اور سند سے بیان کرے، روایت یہی ہو لیکن سند اور ہو تو گویا یہ سند زیادہ باوثوق ہو جائے گی، بات زیادہ قابل اعتماد ہو جائے گی کہ ایک سے زیادہ سندوں اور مختلف واسطوں سے ایک ہی بات آئی ہے تو بات زیادہ صحیح ہے۔ تو گویا پہلی کسی حدیث کو موثق کرنے کے لئے مستخرج کے نام سے کتابیں مرتب کی گئیں جو 'مُستَخرَج' کہلاتی ہیں۔

حدیث کی کتابوں کی بڑی بڑی اور مشہور قسمیں یہی ہیں۔ اور بھی کئی قسمیں ہیں، ان میں سے ایک قسم جزء کہلاتی ہے۔ جزء کے معنیٰ ہیں حصہ، لیکن اصطلاح میں کسی ایک صحابیؓ کی احادیث، یا کسی ایک استاد کی احادیث، یا کسی ایک موضوع پر پائی جانے والی احادیث کے مجموعوں کو جزء کہا جاتا ہے۔ امام بخاری کی کئی کتابیں جزء کے نام سے موجود ہیں۔ بعض اور محدثین نے بھی کتابیں جزء کے نام سے لکھی ہیں، مثلاً جزء حجۃ الوداع' جس میں حجۃ الوداع سے متعلق ساری احادیث یکجا کردی گئی ہیں۔ اسی طرح کسی موضوع پر ساری احادیث ایک ہی جگہ پر جمع کی جائیں تو یہ مجموعہ بھی جزء کہلاتا ہے۔

ایک مجموعہ اربعین کا ہے۔ چالیس احادیث کا مجموعہ، بہت سے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو میری چالیس باتیں سن کر آگے دہرائے اس کے لئے بڑی بشارت ہے۔ اس بشارت کا مصداق بننے کے لئے محدثین نے ایسے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ مختلف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موضوعات پر اربعین کے نام سے چالیس احادیث کے سیکڑوں مجموعے ملتے ہیں ۔ بہ ہر حال یہ کتب احادیث کی بڑی بڑی قسمیں ہیں ۔

محدثین کی اقسام

علم حدیث سے جو لوگ وابستہ ہیں ان میں بڑی تعداد تو ہمارے اور آپ جیسے طالبان علم کی ہوتی ہے ۔ جو طالب علم ہیں وہ تو کسی شمار قطار میں نہیں آتے ، لیکن جن کا درجہ طالب علم سے ذرا آگے بڑھ کر ہے ان میں سب سے پہلا درجہ مُسنِد کا ہوتا ہے ۔ مُسنِد کا مطلب ہے سند بیان کرنے والا ، اَسنَدَ کا مطلب ہے سند بیان کی ، اور یُسنِد وہ سند بیان کرتا ہے ۔ لہٰذا مسند یہاں اسم فاعل کا صیغہ ہے ۔ مسند کے معنٰی ہے سند بیان کرنے والا ، یعنی حدیث کا وہ سنجیدہ طالب علم جو سند کے ساتھ حدیث کا مطالعہ کرے اور اسناد اور رجال اور متن ان سب چیزوں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد آگے بیان کرے ، وہ مسند کہلاتا ہے ۔ یہ سب سے پہلا درجہ ہے ۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے محدث کا ، یعنی وہ شخص جس نے علم حدیث میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ علوم حدیث کا بیشتر حصہ اس کے علم اور مطالعے اور حافظے میں محفوظ ہو ، وہ محدث کہلاتا ہے ۔

اس کے بعد حافظ کہلاتا ہے ۔ ہم لوگ قرآن کے حافظ کو حافظ کہتے ہیں ۔ یہاں حافظ علم حدیث کی ایک اصطلاح ہے جو ائمہ حدیث کے لئے استعمال ہوتی تھی ۔ ایک زمانے میں حافظ ابن حجر عسقلانی گزرے ہیں ، جن سے بڑا محدث ان کے بعد سے کوئی پیدا نہیں ہوا ، ان کو آج تک حافظ ابن حجر کہا جاتا ہے ۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ؒ ایک زمانے تک حافظ ابن تیمیہ کہلاتے تھے ۔ علامہ ابن قیم آج بھی حافظ ابن قیم کہلاتے ہیں ۔ اس درجے کے لوگ جیسے ابن تیمیہ ، ابن قیم اور ابن حجر تھے حافظ کہلاتے ہیں ۔ وہ لوگ جو علم حدیث کے ذخائر کو اپنی یادداشت میں محفوظ کئے ہوئے ہوں اور علم حدیث کے علوم وفنون ان کی یادداشت میں محفوظ ہوں اور علم حدیث کا کوئی گوشہ ان کے مطالعے سے خارج نہ ہو وہ اصطلاحاً حافظ کہلاتے ہیں ۔

اس کے بعد درجہ آتا ہے 'الحجہ' کا ۔ الحجہ سے مختلف لوگوں نے مختلف معنیٰ مراد لیے ہیں ۔ کسی نے کہا کہ جس کو تین لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجہ کہلاتا ہے ۔ کسی نے کہا کہ جس کو پانچ لاکھ احادیث یاد ہوں وہ الحجہ ہے ۔ بہ ہر حال احادیث کی یہ تعداد لاکھوں میں ہے ۔ اس کے بعد درجہ آتا ہے الحاکم کا ، الحاکم سے مراد وہ ہے جس کو ساری دست یاب احادیث زبانی یاد ہوں جو بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث کا ذخیرہ اس وقت موجود ہے وہ سندوں کے ساتھ اس کو زبانی یاد ہو تو وہ الحاکم کہلاتا ہے۔

ان سب درجات کے بعد جو سب سے اونچا درجہ ہے وہ امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے جن بزرگوں کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا ان میں حضرت سفیان ثوری، حضرت عبداللہ بن مبارکؒ، وہ اس درجے کے انسان تھے کہ ایک ایک وقت میں لاکھوں انسان ان سے کسب فیض کے لئے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے حدیث مبارک کی روایت سننے کے لئے لوگ جب جمع ہوئے تو دوران حدیث ان کو چھینک آگئی۔ ان کے ہزاروں شاگردوں نے جب بہ یک آواز اور بہ یک وقت یرحمک اللہ کہا تو اس سے اتنا شور پیدا ہوا کہ لوگ یہ سمجھے کہ بغداد میں شاید فساد ہو گیا اور پولیس چوکس ہو گئی کہ کیا واقعہ ہوا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عبداللہ بن مبارک کو چھینک آئی تھی تو ان کے شاگردوں نے یرحمک اللہ کہا تھا، یہ اس کا شور ہے۔ عبداللہ بن مبارک کی محفل میں شرکت کرنے والے ایک شخص نے بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک جب حدیث بیان کر رہے تھے اور لوگ لکھ رہے تھے تو ایک ایک دوات کو آٹھ آٹھ دس دس آدمی استعمال کرتے تھے۔ اس کے باوجود دواتوں کی کل تعداد ۶۳ ہزار تھی۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک موقع پر قرب و جوار کے ایک کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا، کیوں کہ اپنی دوات میں تازہ پانی ڈالنے والوں کی اتنی کثرت تھی کہ لوگوں کے بار بار پانی لینے سے کنواں خشک ہو گیا۔ دوات میں کتنا پانی پڑتا ہے؟ ایک چھوٹے برتن سے پچیس دواتیں تر ہو سکتی ہیں اور وہاں دوات میں پانی لینے والوں کی وجہ سے کنویں کا پانی خشک ہو گیا تھا۔ یہ عبداللہ بن مبارک بھی امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتے تھے۔

امام احمد بن حنبل بھی امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں۔ امام بخاری اور مسلم ان دونوں کا لقب بھی امیر المومنین فی الحدیث تھا۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس درجے کے انسان کو امیر المؤمنین فی الحدیث کہا گیا۔ بعد میں امام مسلمؒ شاید آخری آدمی ہیں، جن کو اس سلسلے میں یہ لقب دیا گیا۔ ان کے بعد کسی اور محدث کو غالباً ایسا لقب نہیں ملا، سوائے حافظ ابن حجر عسقلانی کے، جن کو علم حدیث کی تاریخ میں امیر المؤمنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا۔

حدیث اور سنت بہ طور ماخذ شریعت

قرآن و سنت میں جو کچھ آیا ہے اس کو اصطلاح میں نصوص کہا جاتا ہے، نص کے لغوی معنیٰ تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبارت یاText کے آتے ہیں۔لیکن اصطلاح میں نصوص سے مراد قرآن پاک اور سنت رسول کی عبارتیں ہیں جو دراصل شریعت کا ماخذ اور مصدر ہیں۔

نصوص کی دو قسمیں ہیں:

کچھ نصوص وہ ہیں جن کو قطعی الثبوت کہا جاتا ہے۔یعنی ان کا ثبوت قطعی اور یقینی دلائل کے ساتھ ہمارے سامنے ہو چکا ہے۔قرآن مجید سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے۔احادیث اور سنت میں بھی خاصا بڑا حصہ قطعی الثبوت ہے۔مثلاً سب کی سب متواتر احادیث اور سنن ثابتہ قطعی الثبوت ہیں۔

لیکن کچھ احادیث ہیں جو تواتر کے کسی درجے تک نہیں پہنچیں، وہ قطعی الثبوت نہیں ہیں اور ان کا درجہ قرآن کریم اور سنت متواترہ سے کم ہے۔

گویا کچھ نصوص ہیں جو قطعی الثبوت ہیں اور کچھ نصوص ہیں جو ظنی الثبوت ہیں۔اسی طرح سے معانی اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان نصوص کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ ہے جو قطعی الدلالت ہے، جس کے معنیٰ اور مفہوم بالکل قطعی اور یقینی ہیں، جن میں کسی اختلاف رائے کی یا کسی دوسری تعبیر کی گنجائش نہیں ہے۔مثلاً قرآن پاک میں ہے اقیموا الصلوٰۃ نماز قائم کرو، اب ہر شخص جو تھوڑی بہت بھی عربی جانتا ہے اور اسلام کی تعلیم سے تھوڑا سا بھی واقف ہے وہ سمجھتا ہے کہ اقیموا الصلوٰۃ سے کیا مراد ہے، اس میں کسی دو تعبیروں کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کچھ نصوص ایسے ہیں جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے۔اور یہ گنجائش اللہ اور رسول نے ایک مصلحت سے رکھی ہے۔جہاں اللہ اور رسول کی حکمت اور منشا یہ تھا کہ شریعت کے احکام کو ایک سے زیادہ انداز سے سمجھا جا سکے، وہاں انہوں نے ایسا اسلوب اور ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں ایک سے زائد تعبیرات کی گنجائش موجود ہے۔قرآن مجید میں بہت سے الفاظ ہیں جو مشترک معنیٰ کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔قرآن پاک فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے۔اس کے باوجود اگر کوئی ایسا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے عربی زبان میں ایک سے زائد معنیٰ ہیں اور وہاں سیاق و سباق میں کوئی ایسا قرینہ بھی نہیں رکھا گیا جس سے ایک معنیٰ متعین ہو سکیں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ قرآن مجید کی کچھ نصوص کو ایک سے زائد انداز میں سمجھا جا سکے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح سے حدیث پاک میں بھی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات فصاحت وبلاغت کے اعلیٰ ترین معیار پر ہیں۔ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام افصح العرب تھے۔ کسی کا یہ تصور کرنا انتہائی بے بنیاد اور مہمل بات ہوگی کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بات تو واضح کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس موقع پر جو بات ارشاد فرمانا چاہتے تھے آپ نے اس موقع پر وہی ارشاد فرمائی اور اس سے جو مفہوم نکلتا ہے وہی مفہوم حضور کا مقصود تھا۔ یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو کسی خاص حکم سے اپنے ذہن میں ایک خاص مقصد رکھتے تھے۔ لیکن چوں کہ لغت کے اعتبار سے اس لفظ کے ایک سے زیادہ مفاہیم نکل سکتے تھے اس لئے لوگوں نے اس کو اور طرح سمجھ لیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا کے خلاف تھا۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمانا چاہا، اسے دوٹوک اور قطعی انداز میں ارشاد فرمایا، اور جس چیز کے بارے میں آپ کا ارادہ یہ تھا کہ اس کو لوگ اپنے اپنے انداز سے سمجھیں، وہ بات آپ نے اس طرح ارشاد فرمائی کہ لوگ اس کو اپنے اپنے انداز سے سمجھے۔

ان دونوں کی ایک ایک مثال میں آپ کو دے دیتا ہوں۔ ایک قرآن پاک سے اور ایک حدیث سے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ آیا ہے کہ اگر کسی شوہر اور بیوی میں اختلاف ہو جائے اور شوہر بیوی کو طلاق دے دے تو جب تک وہ مطلقہ خاتون عدت میں ہے اس وقت تک اس کے اخراجات اس کے شوہر کے ذمے ہوں گے۔ اس موقع پر ارشاد ہوا:

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (۱۵)

خوش حال پر اپنی استطاعت کے مطابق اور نادار پر اپنی استطاعت کے مطابق۔

متاعاً بالمعروف، اس علاقے اور اس زمانے کے معروف طریقے کے مطابق ضروری ساز و سامان دے۔ یہ الفاظ قرآن پاک میں آئے ہیں جن کے قطعی الثبوت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن موسع سے کیا مراد ہے؟ مقتر سے کیا مراد ہے؟ یہ ہر زمانے کے لحاظ سے الگ الگ طے ہو سکتا ہے۔ ایک غریب ماحول میں، ایک فقیر ملک میں دولت مند اور موسع کا مفہوم اور ہوگا اور نادار اور مقتر کا مفہوم الگ ہوگا۔ ایک انتہائی دولت مند ملک میں، مثلاً کویت میں اگر کہا جائے کہ دولت مند اپنی استطاعت کے مطابق دے اور نادار اپنی استطاعت کے مطابق دے، تو کویت کے ماحول میں نادار کے معنیٰ اور ہوں گے پاکستان کے ماحول میں نادار کے معنیٰ اور ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے، پاکستان سے بھی زیادہ کوئی غریب فقیر ملک ہوگا تو وہاں نادار کے معنیٰ اور ہوں گے۔

ایسا اس لئے رکھا گیا کہ اللہ کی مشیت اور منشا یہ تھا کہ چوں کہ ناداری اور دولت مندی اضافی چیزیں ہیں اس لئے ان کو اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھا جائے اور اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے اس کے معنیٰ متعین کئے جائیں۔ اس کے لئے معروف کی قید بھی لگادی، جس سے یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ اس کی بہت سی تعبیریں ممکن ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان کے کسی دیہات میں اگر کسی خاتون کو یہ آزمائش پیش آجائے اور وہ متاع کا مطالبہ کرے تو غالباً یہ کافی ہوگا کہ اس کو رہنے کے لئے مکان دے دیا جائے، اس مکان میں ضروری ساز و سامان ہو، دو وقت کھانے کا انتظام ہو، ناشتے کا انتظام ہو، کپڑے ہوں اور ضروری ساز و سامان ہو۔ شاید اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں یہی معروف ہے۔ جو دولت مند ہوگا وہ پختہ مکان دے دے گا، غریب کچا مکان دے دے گا۔ دولت مند آدمی شاید گھر میں گھوڑا بھی رکھوادے، تانگہ بھی رکھوادے۔ غریب آدمی یہ چیزیں نہیں رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہی واقعہ کسی کے ساتھ پیرس میں پیش آجائے تو موسع اور مقتر کے معنیٰ اور ہوں گے۔ وہاں مطلقہ خاتون یہ مطالبہ کرسکتی ہے کہ جو گھر مجھے رہنے کے لئے دیا گیا ہے اس میں ریفریجریٹر بھی رکھا ہو، اس میں سینٹرل ہیٹنگ کا نظام بھی ہو، اس میں ٹیلیفون کی لائن بھی لگی ہوئی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں وہاں ناگزیر ہیں اور ہر آدمی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں نادار سے نادار آدمی بھی ان چیزوں کے بغیر گزارہ نہیں کرسکتا۔ لیکن پاکستان میں کوئی نادار خاندان یہ مطالبہ کرے تو شائد وہ حق بہ جانب نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شریعت کے احکام میں بعض جگہ اللہ کی حکمت ہی اس بات کی متقاضی رہی ہے کہ اس کے معنیٰ اور مطالب کو زیادہ سے زیادہ عمومی انداز میں سمجھا جاسکے، اور ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے، ہر زمانے کے لوگ اپنے ماحول کے لحاظ سے اس کو سمجھ سکیں۔ یہ معنیٰ ہیں ظنی الدلالت کے، یعنی جس کے معانی اور دلالت کے مفاہیم ظنی ہیں۔ آپ اپنے ظن غالب، فہم وبصیرت اور خیال سے شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے اس کے معنیٰ اور مطالب متعین کرلیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم بدوی لوگ ہیں ریگستان میں سفر کرتے ہیں، ریگستان میں سب سے کم یاب چیز پانی ہوتی ہے، بعض اوقات ہم گزرتے ہیں، راستے میں کوئی تالاب یا گڑھا نظر آتا ہے، اس میں پانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جمع ہے، یا کسی پہاڑ کے دامن میں پانی جمع ہے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ یہ پانی پاک ہے کہ ناپاک ہے۔ اس میں کسی درندے نے منہ تو نہیں ڈالا۔ کسی ناپاک جانور نے اس کو ناپاک تو نہیں کیا تو ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ تو آپ نے جواب میں جو ارشاد فرمایا، اس کے مختلف احادیث میں مختلف الفاظ آئے ہیں، ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

الماء الکثیر لا ینجس

زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

الماء الکثیر طھور لا ینجسه شئی

زیادہ پانی پاک ہے، کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرسکتی۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ یہ الفاظ کہ "زیادہ پانی ناپاک نہیں ہوتا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جوافصح العرب ہیں، آپ کی زبان مبارک سے ارادتاً اور سوچ سمجھ کر نکلے ہیں۔ یہاں آپ نے اسلام کی حکمت تشریع کے پیش نظر ایسے عمومی الفاظ استعمال فرمائے جن کی متعدد تعبیریں ممکن ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو مثلاً یہ فرمادیتے کہ پانی دس یا بیس رطل (ایک پیمانہ) ہو تو ناپاک نہیں ہوتا۔ لیکن آپ نے ماء الکثیر کے الفاظ استعمال فرمائے۔ ماء الکثیر سے کیا مراد ہے؟ کتنا پانی، جتنا کسی بڑے تالاب میں ہوتا ہے؟ اتنا پانی جتنا راول ڈیم میں ہے؟ اتنا پانی جتنا ایک ٹب میں بھرا ہوا ہے، یا اتنا پانی جو ایک کولر میں بھرا ہوا ہے؟ ماء الکثیر کے مفہوم میں لغوی اعتبار سے یہ سب شامل ہیں۔

ہمارے شہر میں شاید ہم ماء کثیر کا یہ مفہوم قرار دیں کہ راول ڈیم کا پانی ماء کثیر ہے، اس لئے کہ اس میں زیادہ پانی ہے۔ لیکن بلوچستان کے بعض علاقوں میں جہاں دس دس میل پانی نہیں ملتا، وہاں کے لوگوں کے نزدیک ایک مشک بھر پانی بھی بہت اور ماء کثیر ہے۔ بعض اور علاقے ایسے ہوں گے جہاں ایک مٹکا پانی بھی بہت زیادہ یعنی ماء کثیر قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بوجھ کر، سوچ کر اور حکمت کی وجہ سے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہر علاقے کے لوگ اپنے حالات کے لحاظ سے اس اصطلاح کے معنی متعین کرلیں۔ چناں چہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے جب یہ حدیث اور اس کی تعبیر کا مسئلہ آیا تو وہ کوفے میں بیٹھے ہوئے تھے، جہاں ایک طرف دریائے دجلہ بہتا تھا دوسری طرف فرات بہتا تھا۔ تو ان کے ذہن میں مائے کثیر کا تصور یہ آیا کہ اتنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بڑا تالاب کہ اگر کوئی ایک طرف سے اس کے پانی کو ہلائے تو اس کی لہر دوسرے کنارے تک نہ پہنچے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ جو مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے جہاں صرف دو کنویں تھے اور ان میں بھی ایک یہودی کا تھا، اور پانی کی قلت تھی۔ اس لئے انہوں نے ایک اور روایت کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے کہا کہ دو ایسے بڑے مٹکے جو لوگ گھروں میں پانی کے لئے رکھتے ہیں وہ اگر پانی سے بھرے ہوئے ہوں تو یہ مائے کثیر ہے۔ اب آپ دیکھیں دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اتنا بڑا تالاب جس میں کم وبیش دس ہزار مٹکے آجائیں وہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مائے کثیر ہے۔ اس کے برعکس امام مالکؒ کے نزدیک مائے کثیر وہ ہے جو دو مٹکوں میں سما جائے۔ یہ دونوں مسالک اپنی جگہ درست ہیں، اس لئے کہ حدیث کے الفاظ میں دونوں کی گنجائش موجود ہے۔ مدینہ میں مائے کثیر یہ ہے، کوفے میں مائے کثیر وہ ہے۔ اس طرح کی احادیث اور آیات قرآنی جن میں ایک سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہو وہ ساری تعبیریں کم از کم لغوی اعتبار سے بہ یک وقت درست ہوسکتی ہوں۔ ضروری نہیں کہ ہر وقت درست ہوں۔ یہ چیز ہے جس کو ظنی الدلالت کہتے ہیں، یعنی وہ نص جس کا معنیٰ ومفہوم ظنی ہو۔

لہذا نصوص شریعہ کی چار قسمیں ہوگئیں۔ ظنی الثبوت اور قطعی الدلالت دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملائیں تو چار قسمیں بنتی ہیں۔ یہ چاروں قسمیں احکام شریعت کا ماخذ ہیں اور اسی ترتیب کے ساتھ ہیں۔ سب سے پہلے وہ چیز جو قطعی الثبوت بھی ہے اور قطعی الدلالت بھی ہے جس میں قرآن پاک کی وہ آیات جو محکم ہیں اور سنت متواترہ اور احادیث ثابتہ میں جو محکمات ہیں شامل ہیں۔ پھر ان نصوص کا درجہ ہے جو قطعی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور قطعی الثبوت ہیں۔ پھر وہ نصوص ہیں جو ظنی الدلالت ہیں اور ظنی الثبوت ہیں۔ یہ ترتیب ہے جس سے احادیث اور آیات دونوں سے احکام کا استدلال ہوتا ہے۔

یہ گفت گو بڑی تفصیل کی متقاضی ہے کہ ان چاروں درجات میں جب استنباط اور استدلال کا عمل شروع کیا جائے گا تو اگر ان دونوں میں کسی میں تعارض ہو تو اس کو کیسے حل کیا جائے گا۔ لیکن ایک عام بات جو کامن سنس اور عقل عام کی بات ہے وہ یہ کہ پہلی صورت کو ترجیح دی جائے گی اور سردست دوسری صورت کو نظر انداز کردیا جائے گا۔ اس لئے جب سنت کی بات بہ طور ماخذ شریعت کے ہوتی ہے تو ہمارے سامنے چاروں چیزیں رہتی ہیں۔ یہ چاروں چیزیں سنت میں بھی پائی جاتی ہیں۔ قرآن پاک میں ان میں سے دو چیزیں پائی جاتی ہیں اور دو نہیں پائی جاتیں۔ قرآن پاک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سارے کا سارا قطعی الثبوت ہے اس لئے ظنی الثبوت والی صورت قرآن پاک میں نہیں پائی جاتی۔ احادیث میں کچھ قطعی الثبوت ہیں کچھ ظنی الثبوت ہیں۔ قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت قرآن پاک میں بھی ہیں اور حدیث میں بھی ہیں۔ اس لئے ان چاروں صورتوں کا انطباق احادیث پر زیادہ ہوتا ہے قرآن پاک کی آیات پر کم ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں بیان ہوا ہے:

الا اننی اوتیت القرآن و مثله معهٗ

یاد رکھو مجھے قرآن پاک بھی دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس جیسی رہ نمائی اور بھی دی گئی ہے۔

قرآن پاک کی متعدد آیات سے، جن کی تعداد سیکڑوں میں ہے، یہ بات زور روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی تھی جو سنت اور حدیث کی رہ نمائی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار فرائض کی نشاندہی کی گئی ہے:

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ(۱۶)

جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

۔یہ جو آخری تین فرائض ہیں یہ تلاوت کتاب سے ہٹ کر ہیں، تلاوت آیات سے مختلف چیزیں ہیں۔ تلاوت آیات تو قرآن پاک کا بیان کر دینا ہوا۔ پھر **یعلمهم الکتاب و الحکمة ویزکیهم** یہ تین کام ہیں۔ ان کا طریقہ کار کیا تھا۔ اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات یا رہ نمائی فرمایا کرتے تھے وہ رہ نمائی کیا تھی؟ وہ رہ نمائی سنت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

خود قرآن مجید میں تین چار مقامات پر قرآن کی تبیین کا فریضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا گیا ہے:

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ(۱۷)

تاکہ آپ وہ تمام چیزیں ان کے لئے بیان کر دیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ یعنی قرآن پاک کی آیات اور مطالب کا بیان کرنا، بیان سے مراد محض تلاوت آیات نہیں ہے، بل کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیان کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو بیان کر دیا جائے ۔ اس کے مقاصد کی تشریح کی جائے ۔ اس میں جو سبق پنہاں ہے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا جائے ۔ اس میں جہاں جہاں انسانی ذہن کی نارسائی کی وجہ سے الجھاؤ کا امکان پیدا ہوسکتا ہے اس ممکنہ الجھاؤ کو دور کیا جائے ۔ جہاں جہاں غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، اس غلط فہمی کے راستوں کو بند کر دیا جائے ۔ یہ ساری چیزیں بیان و تبیین میں شامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو بیان جاری ہوتا تھا، علمائے اسلام نے اس کی قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک مشہور صحابیؓ ہیں حضرت عمران بن حصینؓ۔ وہ ایک مرتبہ اپنے حلقہ درس میں کچھ مسائل بیان فرما رہے تھے ۔ اس زمانے میں خوارج میں سے بعض جاہل اور انتہا پسند لوگ اس طرح کی باتیں کیا کرتے تھے جیسے آج کل کے منکرین حدیث کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی خارجی باہر سے آیا ہوا تھا۔ اس نے آکر کہا کہ لا تحدثنا بالا حادیث آپ ہمیں احادیث نہ سنائیں حدثنا بالقرآن ،قرآن پاک کی باتیں بتائیں۔ حضرت عمران بن حصینؓ نے قدرے ناگواری سے فرمایا کہ میں قرآن ہی کی باتیں بیان کر رہا ہوں ۔ قرآن میں اگر نماز کا حکم ہے تو تمہیں کہاں سے پتہ چلے گا کہ ظہر کی رکعتیں چار ہیں، عصر کی چار ہیں اور مغرب کی تین ہیں ۔ یہ اگر میں سنت سے نہیں بیان کروں گا تو تمہیں کہاں سے معلوم ہوگا۔ سنت سے بیان کروں گا تو یہ قرآن ہی کا بیان ہے ۔ یہ قرآن ہی کا درس ہے، قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے ۔ پھر آپ نے فرمایا کہ خذوا عنا آج یہ ساری معلومات ہم سے لے لو، اگر تم نہیں لو گے تو پھر تمہارے اندر بڑا اختلاف پیدا ہوگا اور تم ایسے معاملات اور مسائل میں الجھ جاؤ گے جن سے نکلنے کا تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا۔

آگے چلنے سے پہلے ایک اور چیز ذہن میں رکھیں، وہ سنت کی ایک خاص قسم ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی دو طریقوں سے آتی تھی:

ایک وہ وحی ہوتی تھی جو وحی جلی کہلاتی ہے ۔ یعنی جس کے الفاظ، جس کی عبارتیں اور کلمات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے، اور جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ یہ وہ وحی تھی جس کے الفاظ اور کلمات معجز ہیں، جس کا اسلوب، معیار، فصاحت و بلاغت معجزے کی سطح تک پہنچی ہوئی ہے، یہ وحی قرآن مجید کہلاتی ہے

اس کے علاوہ جو وحی ہوتی تھی وہ متعین الفاظ میں نہیں ہوتی تھی وہ سنت ہے ۔ جس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صرف معنیاً ور مفاہیم حضور ﷺ تک منتقل ہوئے۔ یہ وحی بعض اوقات جبرئیل امینؑ کے ذریعے سے نازل ہوئی۔ بعض اوقات کسی اور ذریعے سے بھی نازل ہوئی۔ حضور نے خواب میں کوئی چیز دیکھی، یا ویسے اللہ نے دل میں کوئی چیز ڈال دی۔ سنت حضور تک پہنچانے کے لئے وحی خفی کی رہنمائی کے کئی طریقے تھے، جس میں وہ طریقہ بھی شامل تھا جس طریقے پر قرآن مجید نازل ہوتا تھا، اس کے علاوہ بھی کئی طریقے شامل تھے، یہ وحی، وحی خفی کہلاتی ہے۔

دوسری وحی جلی ہے، جو اپنے الفاظ کے ساتھ نازل ہوتی تھی، وحی خفی صرف معانی اور پیغام پر مشتمل ہوتی تھی جس میں الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں تھے، لیکن معانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائے گئے اور حضور نے اپنے الفاظ میں اس کو بیان فرمایا۔ اس دوسری وحی یعنی وحی خفی میں ایک خاص قسم وہ ہے جو بقیہ تمام اقسام سے منفرد حیثیت رکھتی ہے، تعداد میں بھی تھوڑی ہے، لیکن اس کا ایک خصوصی مقام ہے جس کے لئے اس کو حدیث قدسی کہا گیا ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ یا تو صیغہ واحد متکلم یا جمع متکلم میں ارشاد فرماتے ہیں، لیکن بیان کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے الفاظ چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہیں اس لئے یہ وحی قرآن مجید میں شامل نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی، وہ قرآن مجید میں نہیں لکھی جاتی، لیکن وہ اللہ کا کلام ہے۔ مثال کے طور پر صحیح بخاری میں ہے:

۔ مایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی احبه فاذا حببته کنت سمعه الذی یسمع به ویبصره الذی یبصربه و یده التی یبطش بها و رجله التی یمشی بها (۱۸)

بندہ ہمیشہ نفل عبادتوں سے میری نزدیکی ڈھونڈتا ہے یہاں تک کہ میں خود بھی اس کو اپنا دوست کر لیتا ہوں اور جب اس کو اپنا دوست کر لیا تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس وہ دیکھتا ہے، میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اور میں اس کے پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

اور یہ بھی فرمایا:

اذا تقرب العبد الی شبرا تقربت الیه ذراعاً واذا تقرب الی ذراعاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقربت منه باعاً، و اذا اتانی یمشی اتیته هرولة (۱۹)

جب وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں ایک باع (تقریباً ڈیڑھ گز کا فاصلہ) اس کی طرف بڑھتا ہوں، جب وہ میری طرف آہستہ چلتا ہے تو میں لپک کے اس کی طرف چلتا ہوں، جو لپک کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔

یہ ارشاد ربانی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ نے صیغہ واحد متکلم میں ارشاد فرمایا۔ یہ حدیث حدیث قدسی کہلاتی ہے۔

احادیث قدسیہ کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کل احادیث کی تعداد اگر پچاس ہزار ہو، جیسا کہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے یا تئیس ہزار ہو جیسا کہ کچھ اور لوگوں کا اندازہ ہے۔ تو ان میں سے چند سو احادیث قدسیہ کہلاتی ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ احادیث قدسیہ کے مجموعے الگ سے بھی شائع ہوئے ہیں۔ تقریباً ایک درجن مجموعے ہیں جن میں احادیث قدسیہ الگ الگ شائع کردی گئی ہیں۔ ایک مجموعے میں ایک سو کے قریب احادیث ہیں، ایک دوسرے مجموعے میں دو سو بہتر احادیث ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ تین سو احادیث ایک طرح سے قرآن مجید سے ملتی جلتی ہیں کہ اللہ کا کلام ہے اور براہ راست اللہ کی طرف سے ان کا بیان ہوا ہے۔ دوسری طرف یہ احادیث رسول سے ملتی جلتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا۔ گویا ان احادیث کا درجہ قرآن پاک اور حدیث رسولؐ کے درمیان ہے۔ چوں کہ ان دونوں کے درمیان ان احادیث کا درجہ ہے، اس لئے ان کو احادیث قدسیہ کہا جاتا ہے۔

احادیث قدسیہ اور قرآن مجید کے درمیان چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ قرآن مجید معجزہ ہے، احادیث قدسیہ معجزہ نہیں ہیں۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور عبارت کی فصاحت و بلاغت اور کلمات کی بندش و بلندی، یہ معجزہ ہے۔ احادیث قدسیہ میں ضروری نہیں کہ معجزہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ معجزہ ہونے کی حد تک بہت اونچا معیار ہو، ہوسکتا ہے کہ نہ ہو۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی روایت بالمعنیٰ جائز نہیں ہے، قرآن مجید کے مفہوم کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کردیں اور کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **هذا کتاب لا شک فیه** یہ عربی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زبان میں میں نے روایت بالمعنٰی کی ہے، یہ جائز نہیں ہے۔ یہ حرام ہے۔ مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے:

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ (۲۰)

لیکن اگر میں اس مفہوم میں حدیث قدسی کو بیان کردوں تو یہ جائز ہے کہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالٰی نے یہ فرمایا ہے پھر مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کردوں اور نقل کردوں تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، یہ حرام نہیں ہے۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ اصل الفاظ میں بیان کیا جائے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک اگر کہیں لکھا ہوا ہو تو بیشتر فقہا کے نزدیک بے وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر حدیث قدسی لکھی ہوئی ہو تو بغیر وضو اس کو ہاتھ لگانا جائز ہے، اگرچہ ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

چوتھا فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اس شخص کے لئے جائز نہیں ہے جس پر غسل فرض ہو، لیکن حدیث قدسی اس حالت میں بھی پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ادب اور احترام کا تقاضا یہ ہے کہ نہ پڑھے۔ محدثین کرام نے علم حدیث کے انتہائی احترام کی جو مثالیں قائم کی ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ بغیر وضو ارشادات رسول کو نہ پڑھا جائے۔ امام مالکؒ جب درس دیا کرتے تھے ان سے زیادہ اہتمام کے ساتھ علم حدیث کا درس کسی نے نہیں دیا۔ اللہ تعالٰی نے انہیں مال و دولت سے بھی نوازا تھا۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے یہ وہ مکان تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا تھا۔ یہ مکان انہوں نے خریدا تھا اور اس میں رہتے تھے، اور ایک مکان الگ سے خرید کر اس کو درس حدیث کے لئے مختص کیا ہوا تھا۔ وہ حضرت عمر فاروق کا مکان تھا۔ اس مکان میں جب امام مالکؒ درس کے لئے تشریف لایا کرتے تھے تو پورے مکان میں خوش بوئیں بکھیری جاتی تھیں، سفید چادریں بچھا دی جاتی تھیں، امام مالکؒ کی طرف سے لوگوں کی خدمت کرنے، پانی پلانے اور خوش بو لگانے کے لئے ملازمین مامور ہوتے تھے، گرمی کے موسم میں وقفے وقفے سے خوش بو چھڑکی جاتی تھی۔ جس شان سے کوئی بادشاہ دربار میں آتا ہے اسی شان سے امام مالکؒ تشریف لاتے تھے۔ بہترین لباس پہن کر اور خوش بو لگا کر تشریف لاتے تھے اور اتنے وقار سے درس حدیث دیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے دیکھا کہ درس حدیث دیتے ہوئے ان کا چہرہ سترہ مرتبہ متغیر ہوا، لیکن ان کے طرز عمل اور روانی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جب گھر تشریف لائے تو کسی سے کہا کہ دیکھو میرے کپڑوں میں کیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بچھو گھس گیا تھا جس نے سترہ مرتبہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کو ڈنک مارا لیکن انہوں نے ادب و احترام کی خاطر اس مجلس کو موقوف نہیں کیا اور اسی روانی کے ساتھ درس جاری رکھا۔ احترام کا تقاضا تو یہ ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی جائز ناجائز کو جاننا چاہے تو وضو نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی کی تحریر کو چھو سکتا ہے اور غسل نہ ہونے کی حالت میں حدیث قدسی پڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرنا جائز ہے، حرام نہیں ہے۔

پانچواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کی نماز میں تلاوت ہوتی ہے، حدیث قدسی کی نماز میں تلاوت نہیں ہوسکتی۔ اگر کوئی شخص حدیث قدسی نماز میں پڑھ لے تو تلاوت کا جو رکن ہے اور فرض ہے، وہ ادا نہیں ہوگا۔ قرآن پاک کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص ایک حرف کی تلاوت کرے اس کو دس نیکیاں ملیں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، انہوں نے فرمایا کہ **لا اقوال الم حرف** پہلے انہوں نے حدیث بیان فرمائی کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس نے قرآن پاک کے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ پھر انہوں نے اپنی فہم بیان فرمائی کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الم میں ایک حرف ہے، بل الف حرف ولام حرف ومیم حرف' الف الگ حرف ہے لام الگ حرف ہے میم الگ حرف ہے۔ یہ خصوصیت صرف قرآن پاک کی ہے جو حدیث قدسی کو حاصل نہیں ہے۔ حدیث قدسی آپ پڑھیں تو اس میں اتنا اجر نہیں ہے جو قرآن پاک کی تلاوت میں ہے

چھٹا بڑا فرق یہ ہے کہ قرآن پاک وحی جلی ہے اور حدیث قدسی وحی خفی ہے۔

ساتواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک روح امین یا جبرئیلؑ لے کر نازل ہوتے تھے۔ جب کہ حدیث قدسی کسی بھی طریقے سے آسکتی تھی۔

آٹھواں فرق یہ ہے کہ قرآن وحی متلو ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ حدیث قدسی وحی متلو نہیں ہے، اس کی تلاوت نہیں ہوتی۔

نواں فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ متواتر ہیں۔ ضروری نہیں کہ حدیث قدسی بھی متواتر ہو۔ اگرچہ ایک دو قدسی حدیثیں ایسی ہیں جو کہ متواتر بھی ہیں، لیکن اکثر احادیث قدسیہ متواتر نہیں ہیں۔

دسواں فرق یہ ہے کہ قرآن پاک مصاحف میں لکھا ہوا ہے اور یک جا موجود ہے، احادیث قدسیہ مصاحف میں نہیں ہیں اور کسی ایک سرکاری یا باضابطہ مجموعے میں یک جا موجود نہیں ہیں۔

احادیث اور سنت کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے یہ درجنوں نہیں بل کہ سیکڑوں کتابوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں جو آج کتب حدیث کی ہمارے پاس موجود ہیں ان کی [illegible] قسمیں ہیں۔ کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابیں تو وہ ہیں جن کو ان کتابوں کے قابل احترام اور جلیل القدر مرتبین نے بہ راہ راست روایت کر کے مرتب کیا ہے۔ اور کچھ کتابیں وہ ہیں جن کی تعداد زیادہ ہے جو محدثین نے بہ راہ راست روایت کر کے مرتب نہیں کیں بل کہ دوسرے مجموعے سامنے رکھ کر ان مجموعوں سے احادیث کا انتخاب کر کے ان مجموعوں کو مرتب کیا ہے۔

آخری کتاب جو بہ راہ راست روایت کر کے مرتب ہوئی ہے وہ امام بیہقیؒ کی السنن الکبریٰ ہے۔ امام بیہقیؒ اس اعتبار سے سب سے بڑے اور نمایاں محدث ہیں کہ ان کی کتاب آخری کتاب ہے جو بہ راہ راست روایت کر کے مرتب کی گئی ہے۔ ان کے بعد بہ راہ راست حدیث روایت کر کے مرتب کرنے والے دنیا سے ختم ہو گئے۔

امام بیہقیؒ کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی۔ ۴۵۸ھ کے بعد جتنی کتابیں ہیں وہ ثانوی کتابیں ہیں۔ ثانوی سے مراد وہ کتاب ہے جو کسی ایک یا دو تین قدیم تر مجموعوں کو سامنے رکھ کر کسی نے اپنا مجموعہ مرتب کیا ہو، تلخیص کی ہو، شرح کی ہو یا چند کتابوں سے ایک ہی موضوع کی احادیث نکال کر جمع کی ہوں۔ یہ تو ہوتا رہا ہے اب بھی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ لیکن بہ راہ راست روایت کر کے محدث نے اپنے اساتذہ سے سن کر جمع کی ہوں، انہوں نے اپنے اساتذہ سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پوری سند بیان کی ہو پھر احادیث جمع کی ہوں، یہ کام آخری بار امام بیہقیؒ نے کیا ہے۔ ان کے بعد کسی نے نہیں کیا۔

امام بیہقیؒ کی یوں تو بہت سی کتابیں ہیں، لیکن سنن کے نام سے دو کتابیں ہیں۔ ایک السنن الصغریٰ کہلاتی ہے جو دو جلدوں میں ہے اور کم و بیش پانچ ہزار احادیث پر مشتمل ہے۔ دوسری طویل کتاب دس ضخیم جلدوں میں ہے، انہوں نے بہ راہ راست یہ سارا ذخیرہ مرتب کیا ہے۔ حدیث کی بنیادی کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ان کی ہے، اپنے ماخذ کے اعتبار سے بھی اور اپنے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ یہ سنن کہلاتی ہے کیوں کہ فقہی احکام کی ترتیب پر ہے، لیکن اس میں حدیث کے تمام مباحث اور مضامین پر احادیث موجود ہیں اس لئے یہ سنن کبریٰ بھی کہلاتی ہے اور جامع بھی کہلاتی ہے۔ لیکن سنن کبریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔

موطا امام مالکؒ سے لے کر اور سنن کبریٰ بیہقی تک آج ہمارے پاس کتب حدیث کا جو ذخیرہ موجود ہے یہ سب کا سب ایک درجے کی احادیث پر مشتمل نہیں ہے۔ ان میں مندرج احادیث کے درجات مختلف ہیں۔ قرآن پاک سارے کا سارا ایک درجے کا ہے۔ وہ سب قطعی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الثبوت ہے۔ الحمد سے لے کر والناس تک۔ سب ثبوت کے لحاظ سے ایک ہی درجے کا ہے۔ اس کے ایک حرف میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کا زبر زیر سب ایک درجے کی چیز ہے۔ احادیث میں درجات ایک جیسے نہیں ہیں، بل کہ احادیث کے مختلف درجات ہیں۔

درجات، صحت اور قبول کے اعتبار سے علمائے اسلام نے کتب حدیث کے پانچ درجے قرار دیئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ بعض اور محدثین نے چار درجے قرار دیئے ہیں۔ چار درجے ہوں یا پانچ یا تین درجے ہوں، اصل حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ درجہ اول میں صرف وہ کتابیں شامل ہیں جن میں تمام احادیث صحیح ہیں اور مستند ہیں۔ کوئی ایک حدیث بھی ان میں ایسی نہیں ہے جو صحت کے اعلیٰ ترین معیار سے ہٹی ہوئی ہو۔ وہ تقریباً تمام محدثین کے نزدیک اتفاق رائے سے تین کتابیں ہیں، تقریباً کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ شاید ایک آدھ کا کوئی جزوی اختلاف ہوگا۔

احادیث کی یہ تین کتابیں صحت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہیں۔ موطا امام مالکؒ، جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب بعض لوگوں کے خیال میں موطا امام مالکؒ ہے۔ امام شافعیؒ جو بہت بڑے محدث بھی ہیں اور بہت بڑے فقیہ بھی ہیں وہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں۔ موطا امام مالکؒ کے بعد صحیح بخاری کا درجہ ہے۔ جو مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت کی نظر میں اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، یعنی اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب روئے زمین پر صحیح بخاری ہے۔ تیسرا درجہ صحیح مسلم کا ہے جو بعض اہل مغرب کے نزدیک اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔ اہل مغرب سے مراد یورپ یا امریکہ والے نہیں ہیں، بل کہ اسلامی اصطلاح میں اہل مغرب سے مراد اسپین، اندلس، مراکش، الجزائر اور تیونس کے علاقے ہیں۔ یہ مغاربہ یا اہل مغرب کہلاتے تھے، یہ پورا علاقہ دنیائے اسلام کے انتہائی مغرب میں تھا۔ اس لئے وہاں کے لوگوں کی رائے بیان کرنا ہو تو مغاربہ یا اہل مغرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بحث ہمیشہ مسلمانوں میں چلتی رہی کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ ان تینوں میں سے کون سی کتاب ہے۔ جو حضرات موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ موطا امام مالکؒ میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ تمام کی تمام مستند ترین اور صحیح ترین احادیث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالکؒ ان تمام محدثین میں جن کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں اور عام مشہور و معروف ہیں، قدیم ترین مجموعہ حدیث کے مرتب ہیں، امام مالکؒ سے زیادہ قربت رسول اللہ کے زمانہ مبارک سے معروف صاحب تصنیف محدثین میں سے کسی اور محدث کو حاصل نہیں تھی۔علم حدیث میں ایک خاص اہتمام یہ کیا جاتا تھا کہ سند حتی الامکان چھوٹی سے چھوٹی ہو، یعنی راویوں کا بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنا کم ہو اتنا اچھا ہے۔ان میں اعلیٰ ترین سند وہ سمجھی جاتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک کم سے کم واسطے ہوں۔اور جتنے زیادہ واسطے ہوں اتنا ہی سند نازل مانی جاتی تھی۔سند عالی یعنی اونچی سند وہ سمجھی جاتی تھی جس میں کم واسطے ہوں۔اس کے مقابلے میں سند نازل وہ ہوتی تھی جس میں زیادہ واسطے ہوں۔امام مالکؒ کی جتنی سندیں ہیں وہ باقی سب محدثین کے مقابلے میں عالی سندیں ہیں۔ثلاثیات کتب حدیث میں انتہائی اعزاز کی بات سمجھی جاتی ہے۔کتب حدیث میں ثلاثیات سے مراد وہ احادیث ہیں کہ جن کے مرتب کرنے والے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہوں۔تین سے زیادہ نہ ہوں۔امام مالکؒ کی بیشتر سندیں ثلاثی ہیں اور کچھ سندیں ثنائی بھی ہیں جن میں صرف دو واسطے ہیں۔ایک امام مالکؒ کے استاد اور ایک صحابیؓ۔چناں چہ امام مالکؒ کی موطا میں بہت سی احادیث ملیں گی مالک عن نافع عن بن عمر۔امام مالکؒ اپنے استاد نافع سے روایت کرتے ہیں، امام نافع اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔لہٰذا اس علوِ اسناد کی رو سے امام مالکؒ کی کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک سے اقرب ترین کتاب بھی ہے اور وہ اس لئے اصح یعنی صحیح ترین قرار دیئے جانے کے مستحق ہے لیکن امت کی غالب ترین اکثریت کی رائے یہ ہے کہ صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔صحیح بخاری اصح الکتب بعد کتاب اللہ جن اسباب کی وجہ سے ہے ان اسباب پر ابھی گفت گو کرتے ہیں۔لیکن ایک بات ذہن میں رہے کہ موطا امام مالکؒ کی جتنی صحیح احادیث ہیں وہ ساری کی ساری نہیں تو ان کا بیشتر حصہ صحیح بخاری میں شامل ہو گیا ہے۔اس لئے جب صحیح بخاری کو اصح الکتب کہا جائے گا تو موطا امام مالکؒ کی صحیح روایات خود بہ خود اصح الکتب بن گئیں۔ایک دوسری وجہ موطا امام مالکؒ کو اصح الکتب قرار نہ دینے کی یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ جب اپنی کتاب موطا تحریر فرما رہے تھے تو ان کا مقصد صرف اور صرف احادیث کا مجموعہ مرتب کرنا نہیں تھا بل کہ حدیث اور فقہ اور صحابہ اور تابعین کی سنت کی یک جا کرنا مقصود تھا۔لہٰذا امام مالکؒ کی کتاب میں جہاں احادیث ہیں وہاں صحابہ کے اقوال بھی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تابعین کے ارشادات اور آثار بھی ہیں اور اس موضوع پر امام مالکؒ کا اپنا مشاہدہ بھی شامل ہے کہ مدینہ منورہ کا عام طریقہ کیا تھا۔ تو گویا یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا میدان یا دائرہ کار کتب حدیث سے ذرا مختلف اور بڑھ کر ہے۔ یہ خالص حدیث کی کتاب ان معنوں میں نہیں ہے جن معنوں میں حدیث کی اور کتابیں ہیں، اس میں احادیث کے علاوہ بھی بہت سے مباحث ہیں، امام مالکؒ کے اپنے فتاویٰ بھی اس میں ہیں، بعض جگہوں پر امام مالکؒ کے اپنے ارشادات بھی اس میں بیان ہوئے ہیں۔ تو گویا یہ فقہ اور حدیث دونوں کتابوں کا مجموعہ ہے۔ خالص حدیث کی کتابوں میں صحیح ترین کتاب صحیح بخاری ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک صحیح ترین کتاب صحیح مسلم ہے۔ بہرحال یہ تین کتابیں طبقہ اول کی کتابیں ہیں۔

طبقہ دوم کی کتابیں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی نظر میں چار ہیں۔ جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، نسائی اور مُسند امام احمد۔ طبقہ دوم کی کتابیں وہ ہیں کہ جن کی بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں اور اکثر و بیشتر سند کے اعلیٰ معیار پر پورا اترتی ہیں۔ کچھ احادیث ہیں جو صحت کے معیار سے ذرا کم ہیں۔ اور بہت تھوڑی احادیث ہیں جو ضعیف ہیں یا جن کا ضعف بہت نچلے درجے کا ہے، زیادہ سنجیدہ انداز کا ضعف نہیں ہے۔ یہ درجہ دوم کی احادیث ہیں۔

درجہ دوم کی احادیث میں جو بنیادی خصائص ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر چہ یہ صحیحین یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے درجے تک تو نہیں پہنچتیں لیکن ان میں شامل بیشتر احادیث صحیح احادیث ہیں۔ ان کتابوں کے مرتبین نے احادیث میں اپنے لیے جو شروط مقرر کی ہیں اور احادیث کا جو معیار انتخاب رکھا ان میں انہوں نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا، بل کہ اکثر و بیشتر کڑا معیار اپنے سامنے رکھا۔ پھر یہ احادیث جو ان چار کتابوں میں آئی ہیں یعنی ترمذی، ابو داؤد، امام احمد اور نسائی، ان ہیں امت میں قبول عام حاصل ہوا۔ ایک عام مقبولیت ان احادیث کو حاصل ہوگئی، اور محدثین اور فقہا کا ایک اصول یہ ہے (محدثین اس سے اتفاق کم کرتے ہیں فقہا زیادہ کرتے ہیں) کہ اگر کوئی حدیث روایت کے اعتبار سے ذرا کم زور بھی ہو لیکن اس کو تلقی بالقبول حاصل ہو تو وہ حدیث قابل قبول ہے۔ تلقی بالقبول ایک اصطلاح ہے، جس کا مطلب امت کے عام اہل علم نے اس کو قبول کیا ہو اور اس پر عمل درآمد کرتے ہوں، وہ حدیث صحیح کی نشانی ہے۔ ورنہ اگر اس میں کوئی کم زوری ہوتی تو امت عام طور پر اس کو قبول نہ کرتے۔ تلقی بالقبول خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث اونچے درجے کی ہے۔ تو یہ چاروں کتابیں وہ ہیں جن میں درج احادیث کو تلقی بالقبول حاصل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی۔

ان میں احکام شریعت کے تمام بنیادی اصول پائے جاتے ہیں۔شریعت کے جتنے احکام احادیث میں آئے ہیں۔ وہ ساری احادیث بڑی تعداد میں، شاید ننانوے فیصد کے قریب ان کتابوں میں موجود ہیں۔ چناں چہ لوگوں نے لکھا ہے کہ سنن ابوداؤد میں احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ سنن ابوداؤد کی گھر میں موجودگی گویا گھر میں ایک بولتے نبی کی موجودگی ہے کہ نبی کے ارشادات ہروقت آپ کے سامنے رہیں گے۔اوراحکام آپ کو معلوم ہوتے رہیں گے۔

ان کتابوں کے علاوہ احادیث کی جو بقیہ کتابیں ہیں وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے نزدیک تیسرے اور آخری درجے میں آتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن میں ضعیف احادیث بڑی تعداد میں ملتی ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن کی سندوں میں بعض ایسے راوی آئے ہیں جو مجہول الحال ہیں، جن کی کیفیت معلوم نہیں کہ وہ مستند تھے کہ غیر مستند تھے۔اس لئے ان احادیث پر صرف وہ لوگ اعتماد کر سکتے ہیں جو علم حدیث کے متخصص ہوں اور فن روایت اور علم رجال میں متعمق ہوں۔علم حدیث پر اچھی نظر رکھے بغیر ان احادیث میں کم زور یا غیر کم زور کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔عام آدمی کے لئے ان کتابوں سے استفادہ کرنا بڑا دشوار ہے۔اس لئے ان احادیث سے غیر متخصص کو براہ راست استفادہ نہیں کرنا چاہئے۔اس لئے کہ بہت سی غلط چیزیں ہوں گی، کم زور چیزیں ہوں گی تو عام آدمی الجھ کر رہ جائے گا اور پریشان ہوگا۔لہٰذا صرف اہل علم کو ان کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

شاہ ولی اللہ کے علاوہ بقیہ لوگ اس تیسری قسم کی مزید دوقسمیں کرتے ہیں۔ایک قسم وہ ہے کہ جس میں نسبتاً قابل اعتماد چیزیں موجود ہیں۔مثلاً سنن دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبد الرزاق، سنن دارمی۔ یہ وہ ہیں کہ جن میں کچھ نہ کچھ نئی، صحیح اور مستند چیزیں مل جاتی ہیں

ان کے بعد چوتھا درجہ ان کتابوں کا ہے جن میں بالکل قصے کہانیاں اور ادھر ادھر کی باتیں ہیں۔جن کا کوئی پس منظر اور دلیل نہیں ہے۔جن کے پیچھے کوئی مضبوط سند نہیں ہے۔وہ قصے کہانیوں کے انداز میں بیان ہوئی ہیں۔مثلاً دیلمی ایک مشہور محدث ہیں، ان کی کتاب مسند دیلمی ہے، اس طرح ابن مردویہ کی کتاب ہے۔اس طرح سے قصے کہانیوں کی بے شمار کتابیں ہیں۔جن کا کوئی علمی مقام نہیں ہے اس لئے ان کو بالکل نظرانداز کر دینا چاہئے۔اس میں اگر کوئی صحیح چیز آ گئی ہو تو وہ محض اتفاق ہے، ورنہ اکثر و بیشتر یہ کتب قصے کہانیوں سے عبارت ہیں۔

پہلے دو درجے جن میں پہلا درجہ تین بنیادی کتابوں کا اور دوسرا درجہ چار بنیادی کتابوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ یہ چھ کتابیں ہیں یا سات سمجھ لیں کیوں کہ موطاء امام مالکؒ کی ساری احادیث صحیح بخاری میں اور صحیح مسلم میں آگئیں اس لئے اس کو نکال دیتے ہیں۔ جو بقیہ چھ کتابیں ہیں یہ صحت کے اعلیٰ ترین معیار پر فائز ہیں۔ ان کتابوں کی صحاح ستہ کہا جاتا ہے، مسند امام احمد کی بہ جائے اس میں اکثر لوگ سنن ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں۔ بعض لوگ مسند دارمی کو شامل کرتے ہیں، لیکن بیشتر لوگ ابن ماجہ کو شامل کرتے ہیں، سنن ابن ماجہ کے ساتھ یہ چھ کتابیں ہیں، جو کتب ستہ یا صحاح ستہ کہلاتی ہیں۔ اگر حدیث کی کسی کتاب میں کہیں یہ الفاظ بیان ہوں کہ رواہ الستہ، اس کو چھوؤں نے روایت کیا ہے تو وہ استناد کے اعلیٰ ترین معیار پر ہے، یعنی صحیح ترین حدیث جسے چھ کے چھ بڑے محدثین نے بیان کیا ہے۔

ان میں سے ہر کتاب کے کچھ الگ الگ خصائص ہیں۔

امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ جو شخص امام بخاری کی کتاب کو غور خوض سے پڑھ لے تو اس میں ایک تفقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کے گہرے معانی اور حدیث میں پوشیدہ اور پنہاں اندرونی عبرتوں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے۔ یہ امام بخاری کی کتاب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ امام بخاری نے احادیث کے ساتھ ساتھ مختلف حضرات کے بعض اقوال بھی بیان کئے ہیں۔ صحابہ کرام کے اقوال، تابعین کے اقوال، بقیہ اہل علم کے اقوال، جن کو بہ طور حدیث کے وہ نہیں لاتے، بہ طور سند کے نہیں بیان کرتے، بل کہ کسی چیز کے ثبوت یا تائید کے طور پر بیان کرتے ہیں کہ فلاں نے بھی یہ کہا ہے۔ ان کو تعلیقات کہتے ہیں۔ امام بخاری کے ہاں تعلیقات کی تعداد تین سو سے زائد ہے، جو امام بخاری کی اصل کتاب کے متن کا حصہ نہیں ہیں۔ لیکن جب عنوان شروع کرتے ہیں تو ضمناً وہ بات کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کہا ہے جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس حدیث کے معنیٰ کیا ہیں۔

امام مسلم کے ہاں تعلیقات بہت تھوڑی ہیں صرف چودہ پندرہ مقامات پر ہیں۔ گویا امام مسلم کے مندرجات میں صحیح احادیث کی نسبت امام بخاری کے مندرجات کے بہ نسبت بہت زیادہ ہے، اس لئے کہ ان کے ہاں تین سو کے قریب تعلیقات آگئی ہیں جو اس معیار کی نہیں ہیں نہ امام بخاری نے تعلیقات کو بیان کرنے میں اس معیار کو پیش نظر رکھا۔

امام ترمذی کی کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ حدیث کے طالب علم کو حدیث کے ذخائر سے اچھی طرح باخبر کر دیتی ہے۔ مام ترمذی کا اسلوب یہ ہے کہ کوئی حدیث بیان کرنے کے بعد وہ کہتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ وفی الباب عن ابن عمرؓ و عن عائشہؓ و عن ابی ھریرۃؓ۔ اس موضوع پر حضرت ابن عمر، حضرت عائشہؓ اور ابی ہریرہؓ کی حدیث بھی موجود ہے۔ ایک تو وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موضوع پر اور کن کن صحابہ کے بیانات یا روایات موجود ہیں جو بقیہ محدثین بیان نہیں کرتے۔ دوسری بات امام ترمذیؒ کے ہاں یہ ہے کہ وہ حدیث کا درجہ بھی متعین کر دیتے ہیں۔ حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں **ھذا حدیث حسن، ھذا حدیث غریب، ھذا حدیث لانعرفه الا من ھذا الوجه** ' یہ حدیث تو ہے لیکن اس ایک سند کے علاوہ باقی کسی اور سند سے نہیں آئی، یہ کام بقیہ محدثین نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے امام ترمذی کی کتاب حدیث کے طلبہ کے لئے بڑی مفید ہے۔

امام ابوداؤد کی کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث احکام کا بڑا مجموعہ شامل ہے۔ احادیث احکام کا اتنا بڑا مجموعہ نہ صحیح بخاری میں ہے اور نہ صحیح مسلم میں ہے، نہ ترمذی میں ہے اور نہ نسائی میں ہے۔ امام ابوداؤد کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا تعلق ہمارے پاکستان سے تھا۔ وہ صوبہ بلوچستان کے ایک علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ کس ضلع سے ان کا تعلق تھا، لیکن غالباً ضلع قلات یا ضلع خضدار سے ان کا تعلق تھا، بعد میں یہاں سے وہ خراسان چلے گئے، خراسان اور نیشاپور وغیرہ میں رہے۔ پھر وہاں سے عرب دنیا اور بغداد وغیرہ میں تشریف لے گئے اور وہاں انہوں نے اپنی یہ بے نظیر کتاب مرتب فرمائی۔ لہٰذا ہم اہل پاکستان صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک مصنف یعنی امام ابوداؤد کے ہم وطن ہیں۔

امام نسائی کی کتاب کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کے متن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک کی صحت کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ احادیث کے متن کو نقل کرنے میں کہیں کہیں اختلافی روایات ہیں۔ ایک صحابیؓ نے ایک طرح سے نقل کیا ہے دوسرے صحابیؓ نے دوسری طرح نقل کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بات دو مرتبہ ارشاد فرمائی ہو، اور دونوں مرتبہ مختلف الفاظ میں ارشاد فرمائی ہو۔ ہوسکتا ہے ایک ہی مرتبہ ارشاد فرمائی ہو لیکن ان دونوں سننے والے صحابہ کا لہجہ الگ الگ ہو اور سننے والے نے اپنے لہجے میں بیان کر دیا ہو۔ دونوں چیزوں کا امکان ہے۔ اب ان حالات میں یہ تعین کرنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کون سا لہجہ نکلا تھا، یہ خاصی محنت اور تحقیق کا کام ہے۔ امام نسائی نے یہ کاوش کی ہے کہ صحتِ متن کا التزام کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ متن زیادہ سے زیادہ رسول اللہ صلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کے مطابق ہو۔ اسی لئے سنن پر جتنی کتابیں ہیں ان میں ضعیف احادیث کی سب سے کم تعداد سنن نسائی میں ہے۔ یہ نسائی نون کے زبر کے ساتھ ہے نَسائی، اس کا نِساء یعنی عورتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ نَسا وسط ایشیا میں کوئی شہر تھا، جو آج کل غالباً ازبکستان میں ہے، وہاں سے ان کا تعلق تھا۔

ابن ماجہؒ جو اکثر لوگوں کے خیال میں صحاح ستہ کی آخری کتاب ہے۔ اس میں ترتیب بڑی اچھی ہے۔ پہلے کون سی احادیث ہوں، پھر کون سی ہوں، پھر کون سا باب ہو، پھر بڑے ابواب میں ذیلی ابواب کی تقسیم ہے، پھر چھوٹے ابواب میں انفرادی موضوعات کی تقسیم ہے۔ اس سلسلے میں جس محدث نے سب سے زیادہ مفید اور حسین ترتیب اختیار فرمائی وہ امام ابن ماجہ نے اختیار فرمائی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم، یہ دونوں صحیحین کہلاتی ہیں، یعنی دو صحیح کتابیں، اور جب شیخین کا لفظ بولا جائے گا تو بھی بخاری و مسلم مراد ہوں گے۔ متفق علیہ کا لفظ بولا جائے گا تو بھی صحیح بخاری و صحیح مسلم مراد ہوں گی۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں ابواب کے جو عنوانات رکھے ہیں وہ بڑے غیر معمولی ہیں۔ اسی لئے علمائے حدیث نے لکھا ہے کہ **فقه البخاری فی ابوابه**، امام بخاری کو فقہ اور حدیث کی جو سمجھ ہے اور جس گہرائی کے ساتھ شریعت کے احکام کی فہم ان کو حاصل ہے وہ ان کے عنوانات سے سامنے آجاتی ہے۔ امام بخاری کے نزدیک کسی حدیث میں کیا کیا مضامین پنہاں ہیں وہ اس بات سے ہی واضح ہو جاتے ہیں کہ امام بخاری عنوان کیا لگاتے ہیں۔ حدیث کے عنوان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس حدیث سے امام بخاری کیا سبق نکالنا چاہتے ہیں۔ امام بخاری کے برعکس امام مسلم نے نہ کوئی باب رکھا نہ کوئی عنوان رکھا۔ اگرچہ انہوں نے ترتیب موضوعات کے حساب سے رکھی ہے لیکن کسی باب کو بھی کوئی عنوان نہیں دیا۔ بعد میں آنے والوں میں سے امام نووی نے جو اپنے زمانے کے صف اول کے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے، وہ امام مسلم کی کتاب کے شارح بھی ہیں اور ان کی شرح بڑی مشہور ہے۔ اس میں عنوانات کا اضافہ کیا اور اس کے ساتھ ابواب کی تقسیم بھی کی ہے۔ اسی لئے اگر آپ صحیح مسلم کا نسخہ پاکستان کا یا ہندوستان کا چھپا ہوا دیکھیں، تو صحیح مسلم میں عنوانات حاشیے میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اصل کتاب کے متن میں عنوانات نہیں ہیں۔ اس لئے کہ امام مسلم نے اپنی کتاب میں کوئی عنوانات نہیں لگائے تھے۔ عرب دنیا کے چھپے ہوئے جو نسخے ہیں ان میں عنوانات بین القوسین ہیں۔ امام بخاری کے عنوانات بڑے دقت نظر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے حامل ہیں جس کی وجہ سے ان کی کتاب کا درجہ اونچا ہو گیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب کے شروع میں ایک بڑا جامع مقدمہ بھی لکھا ہے۔ امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کتاب شروع کر دی ہے۔ امام مسلم نے اپنی کتاب میں ایک مقدمہ لکھا اور تفصیل سے بیان کیا کہ اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت کیوں پیدا ہوئی، اس کتاب میں کن شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہے، اس کی وضاحت کی، پھر معاصرت، امکان لقا اور وجوب لقا پر گفت گو کی۔ اس اعتبار سے ان کی کتاب کا درجہ تھوڑا سا اونچا ہے۔ امام بخاری نے کوئی مقدمہ نہیں لکھا۔ کتاب کے بارے میں جو کچھ ان کے ذہن میں تھا وہ کتاب کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے۔ انہوں نے خود اپنے اسلوب، مقاصد اور اہداف کو بیان نہیں کیا، جب کہ امام مسلم نے خود بیان کیا ہے۔

امام بخاری کے ہاں ایک چیز جو ایک پہلو سے بہت مفید ہے اور ایک پہلو سے وہ ہمارے جیسے طلبہ کے لئے مشکل پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے ہاں احادیث موضوعات کے اعتبار سے یک جا نہیں ملتیں۔ ایک حدیث کے ایک جملے سے اگر امام بخاری کوئی خاص استدلال کرنا چاہتے ہیں تو اس حصے کو ایک باب میں بیان کریں گے، دوسرے جملے کو کتاب کے دوسرے حصے میں بیان کریں گے، تیسرے جملے کو تیسرے حصے میں بیان کریں گے۔ یا حدیث اگر ایک سے زائد موضوعات پر مشتمل ہے تو اس کی ایک روایت ایک باب میں آ جائے گی، دوسری روایت دوسرے باب مین آ جائے گی۔ اگر آپ یک جا دیکھنا چاہیں تو جب تک پوری صحیح بخاری بار بار نہ پڑھیں، اس وقت تک موضوع سے متعلق تمام احادیث کو تلاش کرنا بہت دشوار ہے۔ اس طرح تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر چہ قدیم محدثین ایسے تھے جو زبانی بتا دیا کرتے تھے کہ یہ حدیث فلاں باب میں ہے، اور وہ حدیث فلاں باب میں ہے، لیکن آج کل دشوار ہو گیا ہے، لوگوں کا حافظہ اتنا تیز نہیں ہے۔ البتہ مسلم کے ہاں ساری احادیث یک جا مل جاتی ہیں۔ مثلاً امام مسلم جب ایمان پر بات کریں گے تو وہاں ایمان سے متعلق ساری احادیث یک جا مل جائیں گی۔ جہاں علم کی بات ہو گی وہاں علم سے متعلق ساری احادیث یک جا ہوں گی۔ جہاں نفاق سے متعلق بات ہو گی وہاں نفاق سے متعلق ساری احادیث یک جا ہوں گی، یہ فرق اور موازنہ ہے امام بخاری اور امام مسلم کی کتابوں کے درمیان۔

ایک چھوٹا سا فرق اور بھی ہے، بل کہ ایک اعتبار سے یہ ایک بڑا فرق ہوگا۔ وہ یہ کہ امام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بخاری نے ضبط الفاظ پر نسبتاً کم زور دیا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے الفاظ کیا تھے۔ جن راویوں نے احادیث کو بیان کیا ہے ان میں اگر متن کا اختلاف ہے تو وہ کیا ہے، اس پر امام بخاری نے زیادہ زور نہیں دیا ہے۔ جب کہ امام مسلم نے اس پر بہت زور دیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مسلم جب حدیث بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ حدثنا ھناد، حدثنا عبداللہ اللفظ لعبداللہ کہ مجھ سے یہ حدیث ھناد نے بھی بیان کی، عبداللہ نے بھی بیان کی، اور یہ الفاظ جو میں بیان کر رہا ہوں یہ عبداللہ کے ہیں۔ اس سے گویا اشارہ یہ دینا مقصود ہے کہ ھناد نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے، لیکن تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ، دیگر روایات جب سامنے آئیں گی تو آپ کو اس فرق کا اندازہ ہو جائے گا۔ امام بخاری جب حدیث بیان کرتے ہیں تو یہ تعین نہیں ہوتا کہ الفاظ دونوں راویوں کے ایک جیسے تھے یا دونوں کے الفاظ الگ الگ تھے۔ الگ الگ تھے تو یہ الفاظ کس راوی کے ہیں، یہ تفصیل آپ کو امام مسلم کے ہاں ملتی ہے۔

دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں، یعنی صحابہ، تابعین اور تبع تابعینؒ کے دور میں اکثر و بیشتر لوگ بل کہ سارے ہی لوگ انتہائی مخلص، سچے، ذمے دار، تقویٰ رکھنے والے اور خوف خدا سے سرشار ہوتے تھے، اس لئے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیان کرنے میں کوئی کوتاہی کرے گا۔ لیکن بعد میں ایسے لوگ بھی میدان میں آ گئے جن کے بارے میں یہ محسوس کیا گیا کہ شاید یہ پوری ذمے داری سے کام نہ لیں۔ چوں کہ محدثین کی معاشرے میں بہت عزت ہوئی، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ رکھا اور ان کا احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ ہونے لگا، تو بہت سے ایسے لوگ بھی میدان میں آ گئے کہ جن کا مقصد دنیاوی عزت تھا، یا کم از کم جزوی طور پر وہ دنیاوی عزت میں بھی دل چسپی رکھتے تھے۔ جوں جوں ایسے لوگوں میں اضافہ ہوتا گیا محدثین اپنا معیار کڑا کرتے گئے، بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کو مزید سخت کرتے گئے۔

اب تک حدیث بیان کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے۔ ایک طریقہ یہ ہوتا تھا کہ طلبہ سامنے بیٹھ گئے۔ محدث، مثلاً امام بخاری نے اپنی یادداشت یا اپنے تحریری ذخیرے سے حدیث بیان کرنی شروع کر دی اور لوگوں نے لکھنا شروع کر دی، لوگوں کی تعداد خاصی بڑی ہوتی تھی اور درمیان میں مستملی بھی ہوتے تھے یعنی ہر دو چار سو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی بیٹھا ہوتا تھا جو بلند آواز سے ان الفاظ کو دہراتا تھا۔ جیسے مکبر اذان کے الفاظ دہراتا ہے یا نماز میں اللہ اکبر دہراتا ہے۔ بعض اوقات کئی کئی سو مستملی ہوا کرتے تھے جو ان الفاظ کو دہرایا کرتے تھے۔ محدث نے ایک لفظ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زور سے کہا کہ **انما الاعمال بالنیات** ' اب پہلے مستملی نے دہرایا، پھر دوسرے نے پھر تیسرے نے پھر چوتھے نے، اور کوئی پندرہ بیس منٹ میں سب لوگوں نے لکھا۔ پھر اس نے اگلا جملہ بولا پھر اس سے اگلا۔ ایک طریقہ تو یہ تھا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ طلبہ کے پاس تحریر ذخیرے موجود ہیں۔ امام بخاری نے جو لکھا، طلبہ نے اس کے تحریری نسخے پیشگی ہی حاصل کر لئے۔ لیکن اب طالب علم امام بخاریؒ کو سنا رہا ہے اور سننے کے دوران جہاں غلطی ہے وہ ٹھیک کر دیتے ہیں اور غلطی نہیں ہے تو سن کر کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، میں نے اجازت دے دی ہے، اب تم میری طرف سے روایت کر سکتے ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ سب سے پڑھ کر سنتے تھے۔ اگر چار پانچ ہزار طلبہ ہوں تو سب سے پڑھوا کر نہیں سنا جا سکتا۔ اس میں تو ایک ایک حدیث کے لئے پورا سال چاہئے۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ ایک طالب علم پڑھتا تھا اور بقیہ سنتے تھے اور پھر امام بخاری یا جو بھی محدث ہوتے تھے وہ اجازت دیتے تھے کہ اس طرح سے آپ سب لوگوں کو پڑھنے کی اجازت ہے۔ درمیان میں بطور احتیاط کسی سے سن بھی لیا، کبھی ایک سے کبھی دوسرے سے، اور سب کے بارے میں اندازہ ہو گیا کہ سب نے پڑھا ہے۔

بعد میں محدثین نے ان تینوں طریقوں کے تین درجات مقرر کئے۔ یہ تین گویا الگ الگ درجات ہو گئے۔ ایک تو وہ کہ جس میں محدث نے خود پڑھا اور لوگوں نے سنا۔ دوسرے میں طالب علم نے خود پڑھا اور محدث نے سنا۔ تیسرے میں ایک طالب علم نے پڑھا اور محدث نے سنا لیکن دوسرے بہت سے طلبہ نے بھی سنا۔ امام مسلم کے ہاں ان تینوں میں الگ الگ فرق کیا گیا ہے۔ امام بخاری کے ہاں یہ فرق نہیں ہے۔ امام مسلم کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر امام مسلم نے کہا کہ حدثنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم کے استاد نے حدیث پڑھی، امام مسلم نے سنی اور سن کے لکھی۔ اگر امام مسلم نے کہا کہ اخبرنا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ امام مسلم نے حدیث پڑھی، ان کے استاد نے سنی اور سن کے اجازت دے دی۔ اور اگر کہیں ایسا ہوا کہ امام مسلم اپنے استاد کے درس میں موجود تھے، کسی اور نے حدیث پڑھی امام مسلم نے سنی، تو امام مسلم کہتے ہیں کہ اخبرنا فلان قراۃ علیہ وانا اسمع، ان کے سامنے پڑھا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ آپ دیکھیں کہ accuracy کی اس سے بہتر مثال دنیا میں کہیں مل نہیں سکتی۔ اگر آپ یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے یہ بیان کریں تو وہ دنگ رہ جائیں گے کہ کسی کام میں اتنی accuracy بھی ہو سکتی ہے کہ محدث نے خود نہیں پڑھا، میرے استاد کے سامنے پڑھا جا رہا تھا، اور دوسرے طالب علم کے ساتھ ساتھ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سن رہا تھا، استاد نے اس طرح سن کر اس کی اجازت دی تھی ۔ یہ باریک فرق امام مسلم کے ہاں ہے، جو امام بخاری کے ہاں نہیں ہے۔

تعداد کے اعتبار سے صحیح مسلم کی احادیث زیادہ ہیں، صحیح بخاری کی احادیث کم ہیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ حدیث کی ہر کتاب میں ایک ایک حدیث بار بار آتی ہے، مثلاً ایک حدیث میں اگر خطبہ حجۃ الوداع کا ذکر آئے گا تو اس میں درجنوں موضوعات پر بات ہوئی ہے۔ تو جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر ہے وہاں خطبہ حجۃ الوداع کا بھی ذکر آئے گا، جہاں لوگوں کی مساوات کا ذکر ہے وہاں بھی اس خطبے کا حوالہ آئے گا۔ جہاں حج کے احکامات کا ذکر ہے وہاں بھی خطبے کا کوئی نہ کوئی حصہ زیر بحث آئے گا۔ جہاں منیٰ کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گی۔ جہاں عرفات کا ذکر ہے وہاں بھی آئے گا۔ اس طرح ایک حدیث کئی ابواب میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں تکرار اور مکررات بہت ہوتے ہیں۔ مکررات کو نکالے بغیر اگر صحیح بخاری کی احادیث کو گنا جائے تو صحیح بخاری کی احادیث کی تعداد نو ہزار بیاسی ہے۔ یہ تعداد حافظ ابن حجر نے بیان کی ہے۔ اس میں مکررات بھی شامل ہیں، تعلیقات بھی شامل ہیں، متابعات بھی شامل ہیں اور شواہد بھی شامل ہیں۔ مکررات کو اگر نکال دیا جائے اور صرف وہ احادیث جو بہ راہ راست پوری سند کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہوئی ہیں وہ نکالی جائیں تو دو ہزار چھ سو دو ہیں۔ اس کے برعکس صحیح مسلم میں کل چار ہزار احادیث ہیں۔ گویا چار ہزار احادیث صحیح مسلم میں ہیں، اور دو ہزار احادیث صحیح بخاری میں ہیں۔

احادیث کی کل تعداد کیا ہے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا بڑا دشوار ہے، لیکن ایک عام اندازہ یہ ہے مکررات کو نکالنے کے بعد کل متون تیس سے چالیس ہزار کے درمیان ہیں۔ آج کل کمپیوٹر کا زمانہ ہے، بہت سے لوگوں نے حدیث کی کتابیں کمپیوٹرائز کرنا شروع کی ہیں، کچھ دنوں کے بعد جب ساری کتابیں کمپیوٹرائزڈ ہو جائیں گی تو تمام احادیث کی اصل تعداد سامنے آجائے گی۔ اس میں بھی قطعیت کے ساتھ تعداد کا تعین کرنا دشوار ہوگا۔ اس لئے کہ کمپیوٹر مکررات کی شناخت نہ کرسکے گا۔ ایک حدیث کے الفاظ اگر مختلف ہیں، لیکن مفہوم ایک ہے تو کمپیوٹر اس کو دو احادیث قرار دے گا، لیکن حدیث کا طالب علم اسے ایک ہی حدیث سمجھے گا۔ اس لئے قطعیت کے ساتھ کمپیوٹر کے لئے بھی دشوار ہوگا کہ بالکل درست تعداد بتاسکے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حجیت سنت

حجیت سنت یعنی سنت کتاب اللہ کے ساتھ حجت ہے اور قرآن مجید کے احکام کی شارح ہے۔ اس پر فقہائے اسلام نے بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا ہے، اور سنت کے کردار پر بات کی ہے۔ قرآن مجید میں بنیادی اصول یعنی اصول عامہ ہیں۔ سنت میں ان اصولوں کی تطبیق بیان کی گئی ہے، قرآن پاک میں اجمال ہے۔ سنت میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ یہ ہے:

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ (۲۱)

جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کر دے۔

بیان کی مختلف قسمیں ہیں، سب سے پہلے تو بیانِ مراد ہے کہ کسی چیز سے اللہ تعالیٰ کی مراد کیا ہے۔ اقیموا الصلوٰۃ میں الصلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ وللہ علی الناس حج البیت میں حِج سے مراد کیا ہے؟ خذ من اموالھم صدقۃ میں صدقے سے مراد کیا ہے؟ یہ ساری چیزیں محتاج وضاحت ہیں، اور سنت کا کام یہ ہے کہ ان چیزوں کی اصل معنٰی کو واضح کر دے۔

سنت اگر نہ ہو تو پھر قرآن پاک کے ان الفاظ کے کوئی معنٰی متعین نہیں کئے جا سکتے۔ نہ لغت کی مدد سے متعین کئے جا سکتے ہیں نہ کسی اور ذریعے سے۔ قرآن پاک میں اعتکاف کا تذکرہ ہے وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِدْ (۲۲) اعتکاف سے کیا مراد ہے؟ عاکف کس کو کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس طرح کے درجنوں نہیں سیکڑوں احکام ہیں، جن کی کوئی تعبیر وتشریح کسی کے لئے ممکن نہیں ہے، اگر سنت کی تعبیر وتشریح ہمارے سامنے نہ ہو۔

اس طرح قرآن پاک کی کچھ آیات میں کچھ الفاظ ہیں جن کے لئے مبہم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے، یعنی ان کی مراد واضح نہیں ہے، سنت سے ان کی تفسیر ہو جاتی ہے۔ کچھ آیات ہیں جو مجمل ہیں، سنت سے ان کی تقیید ہو جاتی ہے، سنت اس کو قید کر دیتی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے۔ کچھ الفاظ ہیں جو قرآن مجید میں عام استعمال ہوئے ہیں، سنت ان کو خاص کر دیتی ہے کہ اس سے خاص مراد یہ ہے اور اس سے باہر نہیں ہے۔ کچھ احکام ہیں جن کے لئے تشریح کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو نافذ کیسے کیا جائے گا، سنت سے ان احکام کی شرح ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں کچھ احکام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں کہ سنت سے اس کے دائرے میں توسیع ہو جاتی ہے کہ اگر چہ اس کا دائرہ بہ ظاہر یہاں تک معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا انطباق آگے بھی ہوگا۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ قرآن میں ان کے متعلق ایک اصول آیا ہے لیکن اس اصول سے کون کون سے جزوی مسائل نکلتے ہیں، ان کی مثالیں سنت نے دے دی ہیں۔ یہ کام ہے، قرآن پاک کی رو سے سنت رسول ﷺ کا یہ کام ہے کہ ان سب چیزوں کی وضاحت کرے۔ مثال کے طور پر قرآن پاک میں ایک اصول دیا گیا:

لَاتَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۲۳)

ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ سوائے اس کے کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے تجارت اور لین دین ہو۔

آپس کی رضامندی یعنی کھلی، آزادانہ اور برابر کی رضامندی کے ساتھ آپس میں تجارت ہو تو یہ مال لینا جائز ہے۔ اس کے علاوہ ایک دوسرے کا مال لینا کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے۔ اب یہ قرآن کریم کا ایک بنیادی اصول ہے، اس کا انطباق کیسے ہوگا اور کہاں کہاں ہوگا۔ اس کی بے شمار مثالیں حدیث میں ملتی ہیں۔ حدیث کی یہ جزوی مثالیں قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں، بل کہ قرآن مجید میں بیان کردہ اسی چیز کی تشریح ہیں، مثلاً حدیث میں آیا ہے:

لاتبع مالیس عندك (۲۴)

جو تمہارے پاس نہیں اس کو فروخت مت کرو۔

جس چیز کے تم آج مالک نہیں ہو اس کو فروخت مت کرو۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تراضی سے کیا تعلق ہے، ذرا غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا تراضی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ مثلاً میں راول ڈیم میں شکار کھیلنے جانا چاہتا ہوں اور آپ مجھے ایک ہزار روپے دے دیں کہ جتنی مچھلی شکار ہوگئی وہ آپ کی۔ یہ جائز نہیں ہے۔ یہ عن تراضٍ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ میرے ذہن میں یہ ہو کہ بیس پچیس کلو مچھلی ملے گی اور میں نے اسی بیس پچیس کلو مچھلی کے لئے ایک ہزار روپے لے لئے۔ اب میں نے آ کے کہا کہ مجھے تو یہ چھوٹی سی ایک ہی مچھلی ملی ہے یہ لے لو۔ ظاہر ہے کہ ایک ہزار روپے میں ایک چھوٹی سی مچھلی آپ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس میں چاہوں گا کہ آپ ایک ہزار روپے میں ہی ایک مچھلی قبول کر لیں۔ میں سخت ناراضی کا اظہار کروں گا اور آپ سے جھگڑوں گا تو تراضی تو ختم ہوگئی۔ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ ہو کہ ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہزار روپے میں تو دس کلو مچھلی ملے گی، اتفاق سے وہاں پچاس کلو مچھلی نکل آئی۔ اب آپ کی خواہش ہوئی کہ یہ تو ایک ہزار روپے میں دس ہزار کی مچھلی مل گئی، ظاہر ہے کہ میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں گا۔ اس جھگڑے سے بچنے کے لئے یہ ہدایت دی گئی کہ اس چیز کی خرید و فروخت ہی نہ کرو جو ابھی تمہارے قبضے اور ملکیت میں نہیں ہے، لاتبع مالیس عندك سے یہ مراد ہے، گویا جو چیز تجارت میں ترضی کو متاثر کرے اور آگے چل کر اس کے منافی ثابت ہو وہ جائز نہیں۔ تراضی سے مراد ہے دونوں فریقوں میں برابر کی آزادانہ رضامندی۔

خلاصہ یہ کہ ایک مچھیرا شکار شروع کرنے سے پہلے ہ سودا کر لے کہ ہزار روپے دے دیں جتنی مچھلی ہاتھ لگی سب آپ کی۔ یہ جائز نہیں کیوں کہ اس میں عن تراضٍ کی خلاف ورزی ہے۔ اگر مچھلی ہزار روپے سے زیادہ کی پکڑی گئی تو لینے والا تو خوش ہو جائے گا کہ اس کو ہزار روپے میں پندرہ سو کی مچھلی مل گئی لیکن مچھیرے کے دل پر کیا گزرے گی۔ یا فرض کریں کہ مچھلی توقع سے بہت کم ملی تو مچھیرا خوش ہوگا کہ بھئی تین سو کی مچھلی ہزار روپے میں بک گئی لیکن لینے والے کے دل پر کیا گزرے گی۔ تو اس طرح کے دل آزار سودے جن پر دل راضی نہ ہو، جائز نہیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے:

نهیٰ رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع الثمار حتی ان یبلو صلاحها (۲۵)

- درخت میں جب تک پھل کے بارے میں یہ بات واضح طور پر سامنے نہ آجائے کہ وہ پک چکا ہے، اور درخت پر موجود ہے، اس وقت تک اس کی بیع جائز نہیں ہے۔

لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ موسم کے شروع میں ہی باغوں کو فروخت کر دیتے ہیں، جب کہ ابھی پھل لگا بھی نہیں ہوتا، یہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً میں نے اپنے آموں کے باغ کی بیع کی اگلی فصل آپ کو دے دی ہے آپ ایک لاکھ روپے مجھے دے دیجئے۔ اب آم لگے گا کہ نہیں لگے گا، آندھی چلے گی سارا بور گر جائے گا، کوئی ویسے چرا کر لے جائے گا یا باغ میں آگ لگ جائے گی، ہزاروں چیزیں ہو سکتی ہیں، مجھے ان سے بحث نہیں، میں نے اپنے ایک لاکھ روپے کھرے کر لئے، یہ چیز تراضی کے خلاف ہے اور شریعت میں جائز نہیں۔ جب تک یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ پھل لگ چکا ہے اور اب عام حالات میں نہیں گرے گا اس وقت تک اس کی فروخت جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس سے بھی تراضی میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔ ان مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہدایات آئی ہیں وہ قرآن پاک ہی کے کسی بنیادی اصول کی تشریحات ہیں۔

بعض اوقات قرآن پاک میں بتا دیا گیا ہے کہ اس حکم کا یہ دائرہ ہے۔ سنت نے اس دائرے کو وسیع کر دیا کہ اس کا انطباق فلاں جگہ پر بھی ہوتا ہے جو بہ ظاہر الفاظ میں نہیں ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں آیا ہے:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۲۶)

اور پاکیزہ چیزیں ان کے لئے حلال کرے گا اور گندی چیزیں ان پر حرام کرے گا۔

اب طیبات کیا ہیں اور خبائث کیا ہیں۔ اس کی وضاحت بہت سی احادیث میں ہوئی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے:

نهىٰ رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل ذى ناب من كل سباع

ہر وہ درندہ جو اپنے دانت سے شکار کر کے کھاتا ہے اس کا گوشت کھانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ یہ بھی خبائث میں شامل ہے۔ طیبات میں شامل نہیں ہے۔ پھر حدیث میں آپ نے فرمایا کہ ہر وہ پرندہ جو جانور کا شکار کر کے اس کا گوشت کھاتا ہے اس کو سباع میں شامل سمجھا جائے گا گویا وہ بھی طیبات میں نہیں خبائث میں شامل ہے۔ قرآن پاک میں تو ایک عمومی بات ہے لیکن اس کی مثالیں کون بتائے، کیسے پتہ چلے کہ کون سی چیز طیبات میں شامل ہے اور کون سی چیز خبائث میں سے ہے یہ حدیث اور سنت ہی سے پتہ چلے گا۔ ان مثالوں سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے:

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ (۲۷)

دونوں بہنوں سے ایک وقت میں نکاح جائز نہیں ہے۔

ایسا کرنا حرام ہے۔ اب یہ بالکل صریح حکم ہے اور الفاظ میں مزید اضافے کی بہ ظاہر کہیں گنجائش نہیں ہے، لیکن حدیث میں آیا ہے کہ پھوپھی اور بھتیجی سے بھی بہ یک وقت نکاح نہیں ہو سکتا۔ بھانجی اور خالہ سے بھی بہ یک وقت نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ گویا اضافہ ہے ان احکام پر جو قرآن پاک میں آئے ہیں اور ان ہیں حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا۔

اسی طرح قرآن پاک میں جو بات یا حکم مجمل ہے اس کی تفصیل حدیث میں بیان کر دی گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے جس کی مثالوں سے ہر مسلمان واقف ہے۔آپ نے فرمایا:

صلّوا کما رائیتمونی اصلی

جس طرح مجھ دیکھو نماز پڑھتے رہو۔

خذوا عنی مناسککم

حج کے مناسک مجھے دیکھتے جاؤ کرتے جاؤ۔اسی طرح زکوٰۃ کے احکام کی تفصیل بتائی۔

پھر بعض جگہ قرآن پاک میں ایک لفظ عام ہوتا ہے لیکن سنت سے اس کی تخصیص ہو جاتی ہے کہ اس سے فلاں چیز مراد نہیں ہے۔مثال کے طور پر قرآن پاک میں ہے:

يُوْصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۲۸)

اللہ تمہیں حکم دیتا ہے اپنی اولاد کے بارے میں کہ ہر مرد کو آدھا حصہ ملے گا عورت کے مقابلے میں۔

یہ اصول صرف اولاد میں چلے گا اور جگہ نہیں چلے گا، بعض جگہ برابر بھی ہے بعض جگہ زیادہ بھی ہے، سورۃ النساء کو دوبارہ پڑھئے گا تو پتہ چلے گا کہ بعض جگہ عورتوں کا حصہ برابر ہے اور بعض جگہ زیادہ ہے۔ہماری مغرب زدہ عورتوں کو یہ پہلی آیت تو یاد رہتی ہے باقی آیات یاد نہیں رہتیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یرث القاتل

- اگر بیٹا باپ کا قاتل ہو تو اس کو وراثت نہیں ملے گی۔

پوتا دادا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔بھتیجا چچا کو قتل کردے تو وراثت نہیں ملے گی۔ ویسے تو وراثت کا حکم عام ہے اور قرآن پاک میں اس کی تخصیص نہیں ہے۔لیکن حدیث میں اس کی تخصیص کردی گئی ہے۔قرآن پاک کے دوسرے پارے میں سورۃ بقرہ میں ہے کہ تم پر وصیت فرض کی گئی ہے، یہ ایک عام حکم ہے، اس عموم کی تخصیص کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

الا لا وصیة لوارث

سن لو، وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہو سکتی۔

گویا یہ حضور نے تخصیص کردی ہے قرآن پاک کے ایک عمومی حکم کی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ سنت کا کام بس یہی ہے کہ قرآن پاک کے اجمال کی تفصیل کرے یا اس کے دائرے میں توسیع کردے اور اس کے علاوہ سنت کا کوئی کردار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں۔ سنت کا کردار بہ راہ راست احکام دینا بھی ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے رسول کو بھیجا:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ (۲۹)

تا کہ وہ رسول طیبات کو ان کے لئے حلال قرار دے اور خبائث کو ناجائز قرار دے۔

گویا رسول خود بھی جس چیز کو طیب دیکھیں اس کو جائز قرار دیں اور جس چیز کو خبیث دیکھیں اس کو حرام قرار دے سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جائز و ناجائز کے کئی ایسے احکام ہیں جو سنت میں بہ راہ راست ملتے ہیں، جن کی کوئی بنیاد بہ راہ راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ مثلاً خیار شرط کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی ہے۔ ایک صحابیؓ تھے جو بڑے سادہ لوح تھے ان کا نام جہان ابن منقذؓ تھا۔ وہ جب خرید و فروخت کیا کرتے تھے تو اکثر دھوکہ کھا کے آتے تھے۔ گھر والے کہتے تھے کہ آپ تو یہ چیز مہنگی لے آئے، آپ تو غلط لے آئے، یہ تو سستی مل سکتی تھی، انہوں نے حضور سے شکایت کی کہ میں اس طرح جاتا ہوں اور خریداری کے کر گھر واپس آتا ہوں تو گھر والے کہتے ہیں کہ یہ سودا تو غلط ہوا، دوبارہ بازار جاتا ہوں تو بازار کے لوگ مانتے نہیں، مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ جب تم آئندہ خرید و فروخت کرو تو یہ کہہ دیا کرو کہ میں دھوکہ نہیں دینا چاہتا، مجھے اختیار ہوگا کہ میں تین دن تک چاہوں تو اس کو واپس کر سکتا ہوں، شرط رکھ لیا کرو۔ یہ بنیاد ہے تین دن کی شرط کی کہ گویا اگر کوئی خریدار تین دن خیار شرط رکھنا چاہے کہ میں تین دن تک اس پر دوبارہ غور کر سکتا ہوں اور اگر رائے بدلی تو واپس کر سکتا ہوں تو اس کی اجازت ہے، اگر دونوں فریق طے کریں۔ اس کی کوئی بنیاد بہ راہ راست قرآن پاک میں نہیں ہے۔ لیکن بالواسطہ تراضی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر دونوں فریق راضی ہوں تو یہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن پاک میں اس کی حکم کی بالواسطہ بنیاد یں تو ہیں، لیکن بہ راہ راست بنیاد کا تعین کرنا مشکل ہے۔

شفعہ کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر آپ کے پڑوس میں کوئی جائداد مل رہی ہو، یا آپ کسی جائداد میں شریک ہوں، اس میں آپ کا حصہ ہو، اور ایک حصہ دار اپنا حصہ بیچنا چاہے تو یہاں پہلا حق آپ کا ہے بہ نسبت غیر آدمی کے۔ آپ نے اپنی بہن کے ساتھ مکان بنایا ہے اوپر وہ رہتی ہے نیچے آپ رہتے ہیں۔ اب بہن اپنا حصہ بیچنا چاہتی ہے، بہ جائے اس کے کہ کوئی غیر آدمی آئے اور آپ کو اس سے زحمت ہو، آپ کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ آپ شریک جائداد سے کہیں کہ یہ حصہ کسی اور کو دینے کے بہ جائے مجھے دے دو۔ اب بہن کی ذمے داری ہے کہ پہلے آپ کو ترجیح دے اور آپ کے ہاتھ فروخت کرے۔ یہ شفعہ کے بارے میں شریعت کا حکم ہے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج دنیا کے بہت سے قوانین میں استعمال ہوتا ہے اور اب دنیا اس سے مانوس ہوگئی ہے، لیکن انگریز کے زمانے سے پتہ نہیں کیوں یہ چلا آرہا ہے کہ شہری جائداد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، کیوں نہیں ہوتا؟ ہونا چاہئے، شریعت کا منشا تو جائداد پر حق شفعہ کے لاگو ہونے سے ہی پورا ہوسکتا ہے، یہاں شہری جائداد کا استثنا کر دیا گیا ہے اور غیر شہری جائداد پر ہی اس کا انطباق ہوتا ہے۔

یہ اس موضوع پر گفت گو کا مختصر خلاصہ ہے کہ سنت ماخذ شریعت ہے۔ کس طرح ماخذ شریعت ہے، اس کے احکام میں احادیث کے درمات کا لحاظ رکھا جائے گا۔ صحت کے لحاظ سے، ثبوت کے اعتبار سے اور معنٰی کے اعتبار سے احادیث کے جو مختلف درجات ہیں، ان سب کو پیش نظر رکھ کر طے کیا جائے گا کہ کس حدیث سے کون سے احکام نکلتے ہیں۔ اسی کے حساب سے احکام کا درجہ متعین ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ مسلم۔ الصحیح۔ بیروت، دار کتب العلمیہ ۱۹۹۸ء: ج ۴، ص ۲۲۲، رقم ۱۰۱۷

☆ نسائی۔ السنن۔ کتاب الزکاۃ، باب ۶۴

۲۔ بخاری۔ الصحیح۔

۳۔ ابوداود۔ السنن۔ بیروت، دار الفکر ۱۹۹۴ء: ج ۱، ص ۱۴۲، رقم ۳۳۸

☆ النسائی: کتاب الغسل، باب التیمم لمن یجد الماء بعد الصلاۃ

۴۔ احمد۔ المسند۔ بیروت، دار احیاء التراث العربی ۱۹۹۳ء: ج ۵، ص ۱۱۵، رقم ۱۶۷۲۲

۵۔ ابوداود۔ المراسیل۔ بیروت، موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۸ھ: رقم ۵۳۶

۶۔ الحجر: ۹

۷۔ مجمع الزوائد ۲/ ۱۷۱

☆ کنز ۱۰۷۱

۸۔ الذاریات: ۴۲

۹۔ الانبیاء: ۸۸

۱۰۔ بخاری: ۲/ ۱۶۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

☆دار قطنی ۹۸\۲۷ ،رقم ۱۰۵۵

۱۱۔البقرۃ:۲۸۵

۱۲۔الانفال:۲۔التوبۃ:۱۲۴

۱۳۔قاضی عیاض۔الشفا۔قاہرہ، مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۹۵۰ء:ج ا،ص ۴۴

۱۴۔البقرۃ:۲۶

۱۵۔البقرۃ:۲۳۶

۱۶۔آل عمران:۱۶۴

۱۷۔النحل:۴۴

۱۸۔بخاری:ج ۵،ص ۲۳۸۴،رقم ۶۱۳

☆ابن حبان:ج ۲،ص ۵۸،رقم ۳۴۷

☆احمد:ج ۶،ص ۲۵۶

۱۹۔بخاری:ج ۶،ص ۲۷۴۱،رقم ۷۰۹۸

☆مسلم:ج ۴،ص ۲۱۰۲،رقم ۲۶۷۵

۲۰۔البقرۃ:۲

۲۱۔النحل:۴۴

۲۲۔البقرۃ:۱۸۷

۲۳۔النساء:۲۹

۲۴۔بیہقی،سنن الکبریٰ:ج ۸،ص ۹۵،رقم ۱۰۵۵۹

۲۵۔بخاری:کتاب البیوع،باب بیع المزابنۃ

۲۶۔الاعراف:۱۵۷

۲۷۔النساء:۲۳

۲۸۔النساء:۱۱

۲۹۔الاعراف:۱۵۷

☆☆☆

© rasailojaraid.com